انوشا نیپال میں
محمد یونس حسرت

انوشا کی آپ بیتی

چھٹا حصّہ

انوشا نیپال میں

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

فہرست

جگ موہن

ہم پاٹلی پُتر سے روانہ ہوئے تو مُجھے یوں لگا جیسے ایک قیدی تہہ خانے کی بند اور گھُٹی گھُٹی چار دیواری سے نکل کر کھُلی فضاؤں میں آگیا ہے، بہ ظاہر ہم ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر اِس لیے آئے تھے کہ شیش ناگ کے بیٹے کو اُس کا کھویا ہوا راج پاٹ دِلانے میں مدد کر سکیں، لیکن سچّی بات یہ تھی کہ میں نے ٹیکسلا صرف اِس لیے چھوڑا تھا کہ میرا دِل ٹیکسلا اور اُس کے جشنوں اور کھیل تماشوں سے بھر چُکا تھا اور اِس شہر نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ میں صرف اِس خیال سے

سارنگ بابا اور اُوشا کے ہمراہ پاٹلی پُتر کی طرف چلا تھا کہ ٹیکسلا سے دُور ہو کر وہ سب کُچھ بھول جاؤں جو میری آنکھوں نے ٹیکسلا میں دیکھا تھا۔ مگر پاٹلی پُتر میں میری آنکھوں نے وہ کُچھ دیکھا کہ اُس کے سامنے ٹیکسلا کے واقعات کی کُچھ حیثیت نہیں تھی۔

ٹیکسلا میں تو میں نے صرف بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل دیکھا تھا۔ وہاں میرے سوتیلے بھائی نے میرے باپ کا سر کاٹ کر چندر گُپت کو تحفے کے طور پر پیش کیا تھا، مگر پاٹلی پُتر میں بیٹے کے ہاتھوں باپ کے قتل کے علاوہ بھائی کے ہاتھوں بھائی کو موت کے گھاٹ اُترتے دیکھ کر میں اپنے سوتیلے بھائی کو بھول گیا تھا۔ میرے باپ راجا امبھی نے کتنی سچّی بات کہی تھی کہ راجاؤں کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یہ وہ دُنیا ہے جہاں بھائی بھائی کا بیری ہوتا ہے۔ یہاں اپنی گردن بچانے کے لیے بھائی کا گلا کاٹنا پڑتا ہے۔ یہاں بیٹا باپ کو قتل کر کے اُس کی گدّی سنبھالتا ہے۔

میں یہ سب کُچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ٹیکسلا میں بھی اور پاٹلی پُتر میں

بھی۔ اِسی لیے پاٹلی پُتر سے نکل آنے کے بعد میں اپنی طبعیت میں ایک عجیب سا سکون محسوس کر رہا تھا۔ یہ اطمینان اپنی جگہ تھا کہ ہم نے شیش ناگ کے بیٹے کو اُس کا حق واپس دِلانے میں کُچھ نہ کُچھ امداد کی ہے، مگر بڑا اطمینان اِس بات کا تھا کہ ہم راجاؤں اور راج محلوں کی اِس دُنیا سے نکل آئے ہیں جہاں اپنا خون ہی سب سے بڑا دُشمن ہوتا ہے۔ شاید سارنگ بابا اور اُوشا کے جذبات بھی کُچھ ایسے ہی تھے۔ سارنگ بابا اب نیپال کے راستے ہوتے ہوئے کشمیر واپس جانا چاہتے تھے، ایک تو وہ نیپال میں اپنے بعض پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے ملنا چاہتے تھے، دوسرے کوہ شوالک پر شیل شر نگن کی اس پہاڑی پر جانا چاہتے تھے جہاں اُنہوں نے اپنے گرو ناگیسن مہاراج کی خدمت میں اپنی عُمر کا ایک بڑا حصّہ گزارا تھا۔

رہی اُوشا تو وہ بے چاری ویسے ہی ہمارے ساتھ ننھی ہو چکی تھی۔ سارنگ بابا اور انوشا کے ساتھ نے اُسے پورس کے دربار کی نامور رقّاصہ سے ایک جوگن بنا دیا تھا۔

ہم پاٹی پُتر سے چلے اور ترائی کے علاقے میں سفر کرتے ہوئے انومہ ندی کے کنارے پہنچے۔ یہ وہ ندی تھی جہاں پہنچ کر کپل وستُو کے راج کُمار ساکیہ منی گوتم نے اپنا شاہی لباس اُتار دیا تھا، سر کے لمبے لمبے بال تلوار سے کاٹ کر پھینک دیے تھے اور جوگیوں جیسا لباس پہن کر بھیک کا پیالہ ہاتھ میں لے لیا تھا اور اِس طرح وہ باپ بیوی، بچّے، امیروں، وزیروں اور پرجا کو روتا دھوتا چھوڑ کہ راج محل کی عیش بھری زندگی کو ٹھکرا کر سنیاسی بن گیا تھا۔ اسی انومہ ندی کے کنارے ایک کُٹیا میں سارنگ بابا کی ملاقات اپنے ایک پرانے دوست اور ساتھی جگ موہن سے ہوئی جو آس پاس کے علاقے میں جگ موہن رِشی کے نام سے مشہور تھا۔ دُور دُور سے لوگ علاج کے لیے اُس کے پاس آتے تھے، اور کہا جاتا تھا کہ جگ موہن رِشی کسی مرتے ہوئے شخص کے چہرے پر ایک پھونک بھی مار دے تو وہ اُسی وقت بھلا چنگا ہو جاتا تھا۔ چلنے پھرنے سے لاچار مریض اپنے رشتے داروں کے کندھوں پر اُس کی کٹیا میں آتے تھے اور اپنے پیروں چل کر واپس جاتے تھے۔

دِن رات جگ موہن رِشی کی کُٹیا کے آس پاس بیمار لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور وہ پُراسرار طاقت سے اُن سب کو بھلا چنگا کر دیتا تھا، مگر چاند کی ستائیسویں رات ہوتے ہی اُس کی کُٹیا کا دروازہ بند ہو جاتا تھا اور پھر نیا چاند نکلنے تک بند رہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اِن تین چار دِنوں میں جگ موہن رِشی کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا۔

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اِن دِنوں میں کُٹیا کے اندر بند ہو کر کوئی جاپ وغیرہ کرتا ہے جس سے اُس کی پُراسرار طاقت قائم رہتی ہے، بلکہ پہلے سے بڑھ جاتی ہے۔ کئی لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ان دِنوں میں جگ موہن رِشی پوشیدہ طور پر اپنی کُٹیا سے نکل کر شوالاب کی پہاڑیوں میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں تین چار دِن گزار کر پھر اِسی طرح پوشیدہ طور پر کُٹیا میں واپس آجاتا ہے۔

اصل حقیقت کیا تھی؟ یہ تو جگ موہن رِشی ہی جانتا تھا۔ لوگ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ شام کو آسمان پر نیا چاند نظر آنے کے ساتھ جب اُس کی کُٹیا کا دروازہ کھُلا

تھا تو اُس کا چہرہ کُندن کی طرح دمکتا نظر آتا تھا۔

ہم جگ موہن رِشی کے پاس پہنچے تو چاند کی چھبیس تاریخ ہو چکی تھی، دِن ڈھل چُکا تھا اور کوئی ڈیڑھ پہر دِن باقی تھا۔ وہ بیماروں میں گھِرا ہوا تھا، مگر سارنگ بابا کو دیکھتے ہی چھلانگ لگا کر آیا اور اُن سے لپٹ گیا۔ پھر بڑے جوش سے کہنے لگا۔

"یہ میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں یا سچ مُچ سارنگ بابا مُجھے اپنے درشن دینے چلے آئے ہیں؟"

سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تُم کوئی سپنا نہیں دیکھ رہے، تمہارا پُرانا دوست سارنگ بابا تمہاری خدمت میں حاضر ہوا ہے۔"

اور پھر سارنگ بابا نے میری اور اُوشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میرے بچّے انوشا اور اُوشا ہیں۔"

جگ موہن نے ایک نظر مُجھے اور اُوشا کو دیکھا اور پھر اُس کی نظریں میرے گلے

سے جھولتے ہوئے شانی پر جم کر رہ گئیں۔ چند لمحوں تک رہ گھور گھور کر شانی کو دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا:

"سارنگ بابا! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔۔"

"یہ شانی ہے، میرے دوست۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "انوشا کا بھائی، شانی۔"

"کیا یہ وہی سانپ نہیں ہے جو پتھّر پر مُنہ مارے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے؟"

"ہاں، یہ وہی ہے۔" سارنگ بابا بولے۔ "بلکہ اس میں کُچھ صفتیں اور بھی ہیں۔"

جگ موہن نے اور کُچھ نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ ہمیں اپنی کُٹیا میں لے گیا۔ کُٹیا کے ایک کونے میں ہرن کی کھال بِچھی ہوئی تھی۔ اُس نے سارنگ بابا اور ہمیں اُس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود باہر چلا گیا، جہاں مریض اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

سورج ڈوب رہا تھا کہ جگ موہن مریضوں کو بھگتانے کے بعد کُٹیا میں آیا، اور

دروازہ بند کر کے سارنگ بابا سے کہنے لگا۔ ”سارنگ جی، آپ سے مل کر مجُھے اتنی خوشی ہوئی ہے، اپنی خوشی ہوئی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر دُکھ اِس بات کا ہے کہ آپ ایسے وقت آئے ہیں جب اِس کُٹیا میں کُچھ اور مہمان آنے والے ہیں۔ موت ٹل سکتی ہے مگر اِن مہمانوں کا آنا نہیں ٹل سکتا۔ میں اپنے پُرانے دوست اور ساتھی سارنگ بابا اور اُن کے بچّوں انوشا اور اُوشا کو ٹال سکتا ہوں، لیکن اُن کو نہیں ٹال سکتا۔ وہ ہر مہینے کی ستائیسویں رات کو آتے ہیں اور پھر چاند کی پہلی رات تک یہاں وہ کُچھ ہوتا ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔

سارنگ بابا نے کہا۔ ”اگر تُم کہو تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ جب تُم فارغ ہوئے تو پھر آجائیں گے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ جگ موہن نے کہا۔ ”میں کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کی خدمت نہ کر سکوں، یہ دوسری بات ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کو اِس کُٹیا سے نکال دوں۔ آپ سے پہلے اِن دِنوں میں اِس کُٹیا کے اندر اور کوئی نہیں

ٹھہرا، نہ آپ کے بعد ہی کوئی اور ٹھہرے گا۔ اچھّا ہے، اِن دِنوں میں آپ اپنی آنکھوں سے جگ موہن کی زندگی کی اندھیری راتوں کا تماشا بھی دیکھ لیں۔ بس اتنا کہوں گا کہ اپنے شانی کو قابو میں رکھیں اور اگر آپ کے پاس کوئی اور سانپ بھی ہو تو اُسے بھی قابو میں رکھیں۔۔۔۔"

جگ موہن ابھی یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ ایک زبردست پھُنکار سُنائی دی اور نہ جانے کِس طرف سے ایک سانپ کُٹیا میں آ داخل ہوا۔ وہ سیدھا جگ مومن کی طرف آیا اور جگ موہن نے اُسے دیکھتے ہی اپنا بایاں ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ سانپ نے اُس کی کلائی پر کاٹا اور پھر جدِھر سے آیا تھا، اُدھر ہی واپس چلا گیا۔ ہم میں سے کسی کی طرف اُس نے دھیان نہیں دیا۔

جگ موہن چیخ مار کر فرش پر لیٹ گیا اور پھر کُٹیا میں سانپ یُوں آنے لگے جیسے کُٹیا کے باہر بیمار لوگ آتے تھے۔ ہر سانپ اُس کے جسم کے کِسی نہ کِسی حصّے پر ڈستا اور چلا جاتا۔ رات ہونے کے باوجود کُٹیا میں دِن کی سی روشنی تھی اور سانپ

نہ جانے کہاں کہاں سے جگ موہن کو ڈسنے کے لیے آ رہے تھے۔ سارنگ بابا، میں اور اُوشا ہرن کی کھال پر بیٹھے حیرانی کی تصویر بنے یہ سب ماجرا دیکھ رہے تھے۔ سارنگ بابا نے صرف اتنا کیا تھا کہ شانی امبر کو مُجھ سے اور اُوشا سے لے لیا تھا۔

کُٹیا میں ایک عجیب سی خُوش بُو پھیل گئی تھی۔ میں اِس خُوش بُو سے اچھّی طرح مانوس تھا۔ یہی وہ خُوش بُو تھی جو مُجھے تکشک ناگ کے مندر کے شمال میں پہاڑی کے دوسری طرف، وادی کے اُس پُر اسرار غار تک لے گئی تھی جس کے دروازے پر ایک بھاری بھر کم ناگ پہرا دے رہا تھا اور جِس کے اندر سارنگ بابا نے میرے لیے جاپ کیا تھا۔

اِسی پُر اسرا بُو کی رہنمائی میں ایک خوف ناک جنگل کا سفر طے کر کے میں اُس غار تک پہنچا تھا جِس میں اُوشا راجا پورس کے دربار سے غائب ہو کر پہنچ گئی تھی اور جہاں سے میں اُسے دوبارہ پورس کے محل میں لے گیا تھا۔ اب وہی پُر اسرار بُو

جگ موہن رِشی کی کُٹیا میں پھیلی ہوئی تھی اور اِس بُو کی کشش پر سینکڑوں نہیں ہزاروں سانپ کُٹیا کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے، صرف اِس لیے کہ جگ موہن رِشی کے جسم پر کہیں نہ کہیں ڈسیں اور پھر واپس چلے جائیں۔

ساری رات، پھر سارا دِن، اور اُس کے بعد پھر ساری رات، سانپوں کا یہ پُر اسرار اور خوف ناک کھیل جاری رہا۔ جگ موہن رِشی کے جسم پر ایک تِل جتنی جگہ بھی ایسی نہ رہی تھی، جہاں کسی نہ کسی سانپ نے ڈسا نہ ہو۔

جگ موہن پہلے سانپ کے ڈسنے کے ساتھ ہی چیخ مار کر فرش پر لیٹ گیا تھا اور پھر جو اُس پر بے ہوشی طاری ہوئی، وہ آخری سانپ کے ڈسنے تک طاری رہی۔ چاند کی ستائیسویں رات، پھر ستائیسویں دِن اور پھر اٹھائیسویں رات بے ہوشی کی حالت میں ہی سانپ آ آ کر اُسے ڈستے رہے۔ اٹھائیسویں دِن کا سُورج نکلنے سے پہلے پہلے آخری سانپ اُسے ڈس کر جا چُکا تھا۔

اٹھائیسویں دِن کے سُورج کی پہلی کِرن کے ساتھ ہی جگ موہن رِشی نے

جھر جھری لی اور پھر ایک دِل دہلا دینے والی چیخ اُس کے مُنہ سے نکلی۔ سانپ جو زہر اُس کے جسم میں چھوڑ گئے تھے، اُس نے اپنا اثر دِکھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بُری طرح تڑپنے پھڑکنے اور چیخنے چلّانے لگا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس کے جسم پر ہزاروں چھوٹے بڑے زہریلے چھالے نمودار ہو گئے۔ اُس کے تڑپنے پھڑکنے سے یہ چھالے ٹوٹنے لگے اور اُس کا جسم اِن چھالوں کے زہریلے پانی کے ساتھ ساتھ کُٹیا کے فرش کی مٹّی میں لت پت ہو کر ایسا غلیظ ہو گیا کہ دیکھنے والے کو گھِن آنے لگے۔ اِس کے ساتھ ہی اُس کی چیخیں اور بھی ڈراؤنی ہونے لگیں۔ ہر چیخ کے ساتھ اُس کا چہرہ بگڑ جاتا تھا۔ مگر اُس کی اِس ڈراؤنی اور بھیانک حالت کے باوجود سارنگ بابا، میں اور اُوشا بڑے سکون سے بیٹھے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اٹھائیسویں دِن اور انتیسویں رات، ایک دِن اور ایک رات، جگ موہن اِسی طرح تڑپتا پھڑکتا اور دِل دہلا دینے والی چیخیں مارتا رہا۔ اور پھر انتیسویں دِن سُورج کی پہلی کِرن کے ساتھ اُس کی چنیں اور تڑپنا پھڑکنا بند ہو گیا۔ اب اُس کے جسم پر

چھالوں کی جگہ سیاہ اور سفید چتّیاں سی بن گئی تھیں اور کھال آدمی کی کھال سے زیادہ سانپ کی کھال نظر آتی تھی۔

جب انتیسویں دِن کا سُورج غروب ہو کر آسمان پر پہلی رات کا چاند نظر آیا تو جگ موہن رِشی نے اپنی سیاہ اور سفید چتّیوں والی کھال کو یوں اُتار پھینکا جیسے سانپ اپنی کینچلی اُتار پھینکتا ہے۔ اِس کے بعد ہماری نگاہوں کے سامنے وہ جگ موہن رِشی تھا جس کی جلد سر سے پاؤں تک بے داغ تھی اور جس کا چہرہ ایسے کُندن کی طرح دمکتا نظر آتا تھا جو تازہ تازہ بھٹّی سے نکلا ہو۔

اِس نئے روپ میں آنے کے بعد جگ موہن رِشی نے سب سے پہلے سارنگ بابا کے پاؤں چھوئے اور پھر کہنے لگا۔ ”باباجی! اب میں اِس قابل ہوا ہوں کہ آپ کی کُچھ خدمت کر سکوں۔“

اور واقعی اِس کے بعد اُس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ نہ جانے کہاں سے ہمارے لیے ایسے ایسے کھانے مہیّا کیے جو ہم نے اِس سے پہلے کِسی راج محل میں

بھی نہیں کھائے تھے۔اِس کے بعد کئی راتیں ایسی آئیں جب وہ ہمارے پاس بیٹھ کر ساری ساری رات باتیں کرتا رہا۔اُس کی انھی باتوں سے ہمیں اِس حیرت انگیز تماشے کی حقیقت معلوم ہوئی جو قدرت کی طرف سے ہر مہینے کی آخری تاریخوں میں اُس کے ساتھ رچایا جاتا تھا۔

یہ اُس وقت کی بات تھی جب وہ کوہ شوالک میں شیل شر نگن کی پہاڑی پر ناگیسن مہاراج کے پاس ایک مدّت گزارنے کے بعد پُورب کی طرف چل کھڑا ہوا تھا اور تبِّت سے ہو کر نیپال کے ترائی کے علاقے میں سفر کرتے ہوئے انومہ ندی کے کنارے آ کر یہیں ایک کُٹیا بنا کر رہنے لگا تھا۔

ایک صُبح وہ ندی میں نہا رہا تھا کہ کُچھ دُور پانی کی سطح پر ایک انسانی جِسم بہتا ہوا نظر آیا۔وہ جھٹ تیرتا ہوا اُس کے قریب پہنچا اور اُسے کھینچ کر کنارے پر لے آیا۔ دیکھا تو یہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔اُس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور جسم زخموں سے چُور تھا۔یوں لگتا تھا جیسے بہت سے درندوں نے اُس پر حملہ کیا ہو۔

جگ موہن اُس بے ہوش لڑکی کو اُٹھا کر اپنی کُٹیا میں لے آیا اور اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی کو ہوش آ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر سہمی سہمی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا تو جگ موہن نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کرو بیٹی۔ تُم یہاں ہر طرح سے محفوظ ہو۔ یہ بتاؤ کہ تُم کون ہو اور تمہارے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا تھا؟“

لڑکی نے ایک آہ بھری اور پھر آہوں اور سِسکیوں کے درمیان اپنی داستان سُنائی۔ وہ ایک پہاڑی قبیلے کے سردار کی اکلوتی بیٹی تھی اور پُشپا اُس کا نام تھا۔ بہت سے نوجوان اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے، مگر وہ خود پڑوسی قبیلے کے ایک نوجوان سُورج سے شادی کرنے کی خواہش مند تھی۔

رواج کے مطابق سردار نے پُشپا کی شادی کے لیے سوئمبر رچایا۔ سوئمبر میں بہت سے نوجوان شامل ہوئے جِن میں سُورج بھی تھا۔ سوئمبر کی شرط سُورج نے جیت لی مگر سردار نے اُس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ دونوں قبیلوں کے درمیان ایک مدّت سے دُشمنی چلی آتی تھی اور اُن کے درمیان ہر طرح کا رشتہ ناتا بند تھا۔

سردار کے اِس اِنکار کو سُورج کے قبیلے والوں نے اپنی بہت بڑی بے عزّتی سمجھا اور اِس بے عزّتی کا بدلہ لینے کے لیے پُشپا کے قبیلے پر حملہ کر دیا۔ گھُمسان کا رَن پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں قبیلوں کے کتنے جوان خون میں نہا کر موت کی اندھی وادی میں اُتر گئے۔

اِس افراتفری میں، سُورج نے موقع پا کر، پُشپا کو ساتھ لیا اور ندی کا رُخ کیا۔ لیکن بد قسمتی سے پُشپا کے قبیلے کے جوانوں کا ایک دستہ ندی پر موجود تھا۔ اصل میں سُورج نے کنارے کے قریب ایک کشتی پہلے سے تیّار کر رکھی تھی۔ پُشپا کے قبیلے

والوں کو یہ کشتی دیکھ کر سُورج کے اِرادوں کا پتا چل گیا تھا اور اِس قبیلے کے تیر اندازوں کا ایک دستہ، کنارے سے کُچھ دُور، جھاڑیوں میں چھُپا ہوا جیسے سُورج ہی کا انتظار کر رہا تھا۔

جیسے ہی سُورج نے کشتی کی طرف قدم بڑھایا، پُشپا کے قبیلے کے تیر اندازوں نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ سُورج اور پُشپا دونوں گِر پڑے، لیکن پھر سُورج نے پُشپا کو کشتی میں دھکیل دیا اور اُس کا وہ رسّا بھی کاٹ دیا جو کنارے پہ ایک گھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ اِس کے بعد اُس نے خود بھی کشتی میں سوار ہونے کی کوشش کی، مگر پُشپا کے قبیلے کے لوگ موت کا پیغام بن کر اُس کے سر پر آ پہنچے۔ اُن میں سے چند جوان چھلانگ لگا کر کشتی میں آ گئے۔ اُنھوں نے پُشپا کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اُسے دوبارہ کنارے پر لے آئے۔ مگر اِتنے میں سُورج کے قبیلے کے کُچھ جوان بھی وہاں آ پہنچے تھے۔ دریا کے کنارے ایک بار پھر موت نے اپنا خونی کھیل کھیلا اور اِس خُونی کھیل میں خود پُشپا بھی بُری طرح زخمی اور لہولہان ہو گئی۔ اِس لڑائی میں سُورج کے قبیلے والوں کا پلّہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ پُشپا کے قبیلے والوں سے اور تو

کُچھ نہ بن پڑا، اُنھوں نے زخمی پُشپا کو ندی میں دھکا دے دیا۔ پُشپا ندی میں گِرتے ہی بے ہوش ہو گئی اور ندی کا تیز دھار اُسے اپنے ساتھ بہا کر اُس جگہ لے آیا جہاں سے اُسے جگ موہن رِشی نے نکالا تھا۔

پُشپا کی داستان سُن کر جگ موہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا۔ ”تمہاری کہانی بڑی ہی دردناک ہے بیٹی۔ لیکن حوصلہ رکھو، ایک نہ ایک دِن تمہیں سُکھ کی گھڑیاں بھی نصیب ہوں گی۔ قُدرت کا یہی اُصول ہے کہ ہر دُکھ کے بعد سُکھ اور ہر تکلیف کے بعد آرام ہے۔“

پُشپا نے جواب میں کُچھ نہیں کہا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے ہونٹوں سے ایک کراہ نکل گئی۔ جگ موہن ایک دم اُس کے زخموں کی طرف متوجّہ ہوا۔ ناگیش جی کے قدموں میں رہ کر اُس نے بہت کُچھ سیکھا اور بہت کُچھ حاصل کیا تھا۔ اُس نے پُشپا کے زخموں اور خراشوں پر اپنے مُنہ کا لُعاب لگانا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پُشپا کے جسم کے تمام زخم بھر گئے اور تمام خراشیں غائب ہو گئیں۔ کُچھ دیر

بعد پُشپا کے برف ایسے سفید چہرے پر پھر سے گلابی رنگت لوٹ آئی۔ وہ یوں بھلی چنگی ہو گئی جیسے کبھی زخمی ہی نہیں ہوئی تھی۔

جگ موہن نے مُسکراتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”حیران نہ ہو بیٹی۔ ناگیسن جی کی مہربانی سے یہ کام جگ موہن کے لیے ایک معمولی سی بات ہے۔ ہاں، اب تم یہ بتاؤ کہ تُم کیا چاہتی ہو؟ چاہو تو اپنے قبیلے میں واپس جا سکتی ہو اور چاہو تو سُورج۔۔۔“ پُشپا نے جگ موہن کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں اپنے قبیلے میں واپس جانا نہیں چاہتی، میرے قبیلے والوں نے مُجھے انومہ ندی میں دھکا دے کر ایک طرح سے انومہ ندی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میں اُن کے لیے مر چُکی ہوں اور شاید اُنہوں نے سُورج کو بھی زندہ نہیں چھوڑا ہو گا۔ آپ مُجھے یہیں رہنے کی اجازت دے دیں۔ میں اپنی زندگی کے باقی دِن یہیں، اِسی کُٹیا میں پورے کر لوں گی اور بیٹی کی طرح آپ کی خدمت کرتی رہوں گی۔“

”تُم بڑی خوشی سے یہاں رہ سکتی ہو، بیٹی۔“ جگ موہن نے کہا۔

اور یوں پُشپا جگ موہن کی بیٹی بن کر اُس کی کُٹیا میں رہنے لگی۔ اِس کے زخموں کے ٹھیک ہو جانے کی کہانی چند دِنوں میں ہی آس پاس کے سارے علاقے میں پھیل گئی اور پھر دُور دُور سے لوگ مریضوں کو علاج کے لیے اُس کے پاس لانے لگے۔ وہ کسی کے جسم پر ہاتھ پھیرتا، کسی کے چہرے پر پھونک مارتا اور کسی کے زخم پہ لعاب لگا دیتا۔ چلنے پھرنے سے لاچار مریض دوسروں کے کندھوں پر اُس کی کُٹیا میں آتے اور اپنے پیروں چل کر واپس جاتے۔

پھر ایک شام پُشپا یکایک کہیں چلی گئی۔ جگ موہن اُس کے یُوں غائب ہو جانے سے بڑا پریشان ہوا مگر اُس کے پاس آنے والے مریضوں نے اُسے فرصت ہی نہ دی کہ وہ پُشپا کی تلاش کے لیے کہیں جا سکتا۔

پھر کوئی چار روز بعد، جیسے پُشپا یکایک کہیں چلی گئی تھی، ویسے ہی یکایک واپس آ گئی۔ جگ موہن نے اُس سے پوچھا۔ ”تُم کہاں چلی گئی تھیں، بیٹی۔ تمہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ تمہارے یوں چلے جانے سے مُجھے کتنی پریشانی ہو گی؟“

مگر پُشپا نے جگ موہن کے اُن تمام سوالوں کو مُسکرا کر ٹال دیا۔ جگ موہن نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور یہ جان کر چُپکا ہو رہا کہ شاید پُشپا اِس راز میں اُسے شریک کرنا نہیں چاہتی۔

ایک ماہ بعد پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک شام پُشپا یکایک کہیں چلی گئی اور پھر چند روز بعد واپس آ گئی۔ اُس سے اگلے مہینے بھی ایسا ہی ہوا اور پھر اُس سے اگلے مہینے بھی۔ اور تب جگ موہن کو معلوم ہوا کہ پُشپا ہر مہینے چاند کی ستائیسویں شام کو غائب ہو جاتی ہے اور چاند کی پہلی رات کو واپس آ جاتی ہے۔ اس کے یہ تین چار دِن کہاں اور کیسے بسر ہوتے ہیں، یہ ایک ایسا راز تھا جسے وہ اپنے تک ہی رکھنا چاہتی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک بار پُشپا چاند کی ستائیسویں رات کو جانے کے بجائے ایک دِن پہلے ہی چلی گئی۔ جگ موہن رِشی نے کُچھ زیادہ خیال نہیں کیا، مگر ستائیسویں رات کو جب اُس نے اپنی کُٹیا کا دروازہ اندر سے بند کیا تو کُٹیا میں ایک عجیب سی خُوش بُو پھیل گئی۔ اِس کے ساتھ ہی ایک سانپ کُٹیا میں داخل ہوا اور جگ موہن

کے بائیں ہاتھ پر ڈس کر چلا گیا۔ پھر ساری رات، سارا دِن، اور اُس کے بعد پھر ساری رات سانپ آ آ کر جگ موہن کو ڈستے رہے۔ اِس کے بعد جگ موہن ایک دِن رات تک تڑپتا پھڑ کتا اور چیخیں مارتا رہا اور جب آسمان پر پہلی رات کا چاند نظر آیا تو اُس کے جسم سے اُس کی کھال یوں علیحدہ ہو گئی جیسے سانپ اپنی کینچلی اُتار پھینکتا ہے۔

پُشپا پھر واپس نہیں آئی تھی۔ لیکن تب سے جگ موہن مہینے کی ستائیسویں رات کو اپنی کُٹیا بند کر لیتا تھا اور نئے چاند کی رات کو باہر آتا تھا۔ اِن اندھیری راتوں میں اُس کے ساتھ وہ خوف ناک تماشا ہوتا تھا جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چُکے تھے۔ جگ موہن کی یہ پُر اسرار کہانی سُن کر سارنگ بابا مُسکرائے اور پھر کہنے لگے۔ ”میرے دوست، کبھی تُم نے یہ بھی سوچا کہ یہ سب کُچھ تمہارے ساتھ کیوں ہوتا ہے؟“

جگ موہن نے ایک عجیب سی اُداسی سے جواب دیا۔ ”نہیں بابا جی، میں نے بہت

سوچا لیکن کُچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے اور ہر مہینے مُجھے کس پاپ کی سزا ملتی ہے۔ کیا میں نے پُشپا کر اپنے ہاں پناہ دے کر کوئی گناہ کیا تھا؟"

سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ "نہیں میرے دوست۔ یہ بات نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پُشپا چھُپ چھُپ کر سُورج کو ڈھونڈنے جاتی تھی تاکہ اُس کے قبیلے والوں کو اُس کا پتانہ چل سکے لیکن پُشپا کی اس احتیاط کے باوجود اُنہیں پتا چل گیا اور اُس کے بعد وہ کُچھ ہوا جو پُشپا اور سُورج کے وہم و گُمان میں بھی نہ تھا۔ اُنھوں نے سُورج کی طرف سے ایک پیغام بھیج کر پُشپا کو ایک روز پہلے ہی ایک غار میں بُلا لیا اور وہاں اُس کا کام تمام کر ڈالا۔"

"ہائے! ہائے!" جگ موہن نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"بات یہیں ختم نہیں ہوتی، میرے دوست۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "بلکہ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کبھی تُم نے یہ بھی سوچا کہ پُشپا کے غائب ہو جانے کے بعد

اگلی شام سانپ تمہاری کُٹیا میں آ آکر تمہیں ڈسنے کیوں لگے تھے؟“

”میں کیا جانوں!“ جگ موہن بولا۔ ”نہ جانے یہ میرے کن گناہوں کی سزا ہے!“

”یہ تمہارے کسی گناہ کی سزا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ پُشپا تمہارے جسم کے اندر موجود ہے۔ چاند کی ستائیسویں رات کو تمہارے جسم سے پُشپا کی خُوش بُو آنے لگتی ہے، اور یہی خُوش بُو اِن سانپوں کو یہاں لے آتی ہے، کیوں کہ یہ خُوش بُو ایک ناگن کے جسم کی خُوش بُو ہوتی ہے۔“

جگ موہن حیرت سے آنکھیں پھاڑے سارنگ بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے سارنگ بابا کی باتیں ناقابلِ یقین نظر آرہی تھیں۔ اُس نے کہا۔ ”آپ کا کہنا ہے کہ پُشپا میرے جسم کے اندر موجود ہے اور چاند کی ستائیسویں رات کو میرے جسم سے اُس کی خُوش بُو آنے لگتی ہے اور یہ خُوش بُو ایک ناگن کے جسم کی خُوش بُو ہوتی ہے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

سارنگ بابا کہنے لگے۔ ”وہ یوں میرے دوست، کہ پُشپا کا کام تمام کرنے کے بعد اُس کے قبیلے والوں نے اُس کی لاش جلا کر اُس کی راکھ کِسی طرح تمہارے پینے کے پانی میں گھول دی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اُنھوں نے پُشپا کی راکھ کو انومہ ندی میں ڈال دیا ہو، اور تُم نے وہ پانی پی لیا ہو جس میں پُشپا کے جسم کی راکھ موجود ہو۔ بہر حال، یہ جیسے بھی ہوا، پُشپا راکھ کی صورت میں تمہارے جسم کے اندر پہنچ گئی اور تمہارے اندر کی پُراسرار طاقتوں کی وجہ سے اُس راکھ میں ایک ناگن کے جسم کی خُوش بُو آ گئی۔ اب یہ خُوش بُو چاند کی ستائیسویں رات کو اپنے پورے جوبن پر ہوتی ہے اور اِس کے اثر سے نہ جانے کہاں کہاں سے ناگ کھنچ کر تمہاری کُٹیا میں چلے آتے ہیں اور تمہیں ڈستے رہتے ہیں۔“

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔“ جگ موہن نے کہا۔

”اِس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”شاید تمہیں یاد ہو کہ جن دِنوں میں ناگیش جی کی خدمت میں ہوا کرتا تھا، میرے اپنے ساتھ ایسا ہی

بلکہ اِس سے بھی زیادہ حیرت ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ اُن دِنوں وہاں کُچھ لوگ ایسے آ گئے تھے جو اپنی شرارتوں سے ناگیسن جی کی عبادت میں گڑبڑ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ناگیسن جی کو خوش کرنے کی خاطر میں نے اُن سے کئی لڑائیاں لڑیں اور کئی بار انہیں مار بھگایا۔ پھر ایک مُقابلے میں اُنہوں نے مُجھے جان سے مار ڈالا اور میری لاش جلا کر اُس کی راکھ پانی میں گھولی اور اُسے ناگیسن جی کے پالتو ہرن کو پلا دیا۔ پھر یہ ہوا کہ ناگیسن جی نے اپنے علم کے زور سے معلوم کر لیا کہ میں اُن کے پالتو ہرن کے پیٹ میں ہوں۔ اُنہوں نے فوراً مُردوں کو زندہ کرنے والا منتر پڑھا تو میں ہرن کے پیٹ میں زندہ ہو کر بول پڑا اور ناگیسن جی نے ہرن کا پیٹ چاک کر کے مُجھے باہر نکال لیا۔ تُم چاہو تو پُشپا بھی اِسی طرح دوبارہ زندہ ہر کر تمہارے سامنے آ سکتی ہے۔“

”اِس سے اچھّی بات اور کیا ہو گی۔“ جگ موہن نے خُوش ہو کر کہا۔ لیکن فوراً ہی فکر مند ہو کر کہنے لگا۔ مگر اِس کے لیے آپ کو میرا پیٹ چاک کرنا پڑے گا؟“

"شاید اِس کی ضرورت پیش نہ آئے۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "تمہارے اندر کی پُر اسرار طاقتوں نے پُشپا کی راکھ کی خُوش بُو کو ایک ناگن کے جسم کی خُوش بُو میں بدل دیا ہے۔ اِس لیے مُمکن ہے کہ جب پُشپا کو دوبارہ زندگی ملے تو وہ لڑکی کے روپ میں نہ ہو، ناگن کے روپ میں ہو۔ اور اِس کے لیے بھی ہمیں چاند کی ستائیسویں رات تک انتظار کرنا ہو گا۔ اُس وقت تمہارے جسم میں پُشپا کی خُوش بُو بول رہی ہوتی ہے۔ ناگیشن جی کے منتر کی مہربانی سے اُس خُوش بُو کے ساتھ پُشپا خود بھی بول اُٹھے گی۔"

"لیکن وہ ہزاروں ناگ جو اُس وقت آتے ہیں، اُن کا کیا ہو گا؟"

"انہیں سنبھالنا ہمارا کام ہے۔" سارنگ بابا بولے۔ "تُم اس کی فکر نہ کرو۔"

پُشپا کی واپسی

آخر چاند کی ستائیسویں رات آ پہنچی۔ سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق اُوشا نے انومہ ندی سے تازہ مٹّی لا کر کُٹیا کے اندر اور باہر خوب اچھّی طرح لیپ دیا۔ شام ہوتے ہی میں نے کُٹیا سے باہر کوئی بیس بیس ہاتھ جگہ چاروں طرف چھوڑ کر پھونک مار کر آگ کا ایک حلقہ بنا دیا۔ یہ حلقہ سانپوں کو روکنے کے لیے تھا تاکہ آنے والے ناگ کُٹیا سے دُور ہی رہیں اور ہم پورے اطمینان سے اپنا کام کر سکیں۔

چاند کی یہ ستائیسویں رات اِس لحاظ سے عجیب تھی کہ اِس رات پہلے کی طرح جگ موہن کی کُٹیا کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا۔ سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق جگ موہن اِس طرح بیٹھا تھا کہ اُس کا آدھا جسم کُٹیا کے اندر اور آدھا باہر تھا۔ اُس کے پیر باہر کی طرف تھے۔ ایک پیر کو میں نے تھام رکھا تھا اور دوسرے پیر کو اُوشا نے۔ سارنگ بابا کُٹیا کے اندر جگ موہن کے سر کے پاس بیٹھے تھے اور سر جھکائے، آنکھیں بند کیے، شاید اپنے گرو ناگیش جی کے کسی منتر کا جاپ کر رہے تھے۔

پھر فضا میں ایک عجیب سی خُوش بُو پھیل گئی۔ یہ وہی خُوش بُو تھی جس سے میں اچھّی طرح مانوس تھا۔ اِسی خُوش بُو کی رہنمائی میں مَیں سارنگ بابا تک پہنچا تھا۔ یہی خُوش بُو مجھے اُوشا کے غار تک لے گئی تھی اور اِسی خُوش بُو کی وجہ سے ناگ آآ کر جگ موہن کو ڈستے تھے۔ اب اِس خُوش بُو کے اثر سے ناگ پھر جگ موہن کی کُٹیا کی طرف آنے لگے تھے، مگر آگ کے حلقے نے اُن کو باہر ہی روک لیا تھا۔

سارنگ بابا برابر سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے کُچھ پڑھتے رہے اور پھر اُنہوں نے آنکھیں کھولیں، مُنہ ہی مُنہ میں کُچھ پڑھا اور اِس کے ساتھ ہی جگ موہن کے بدن پر زور سے پھُونک ماری۔ سارنگ بابا کی پھونک کے ساتھ ہی ایک پھنکار کی آواز آئی: ”میں اور اُوشا دونوں چونک پڑے اور ہم نے اِرد گرد دیکھا۔ آس پاس کوئی سانپ نہ تھا۔ سارنگ بابا نے ایک بار پھر کچھ پڑھ کر جگ موہن کے جسم پر پھونکا۔ اِس کے ساتھ ہی پھر ایک پھنکار کی آواز گونجی۔ ہم حیران رہ گئے۔ اِس لیے کہ پھنکار کی یہ آواز جگ موہن کے جسم کے اندر سے آئی تھی۔ اِس کے ساتھ جگ موہن تڑپ کر اُچھلا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

اب سارنگ بابا کے اشارے پر میں نے بین سنبھالی اور وہ دُھن بجانی شروع کی جو مہاراجا سیالکوٹ کے محل میں چمپا رانی کے بدن سے چمٹے ہوئے ناگ کو قابو میں کرنے کے لیے بجائی تھی۔ بین بجاتے ہوئے میں جگ موہن کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن مُنہ کسی اندھیرے غار کے بھیانک دروازے کی طرح کھُلا تھا، اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

میں تو سردار کی بیوی کے مُنہ سے سانپ نکلتے دیکھ چکا تھا، مگر اُوشا کے لیے یہ تماشا بالکل نیا تھا۔ اِس لیے جب جگ موہن کے مُنہ میں سے ایک سانپ کا سر باہر آیا تو اُوشا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جوں ہی سانپ اپنا سر اوپر اُٹھائے باہر نکلنا شروع ہوا، سارنگ بابا کا بائیاں ہاتھ تیزی سے آگے بڑھا اور اُنہوں نے اُس کی گردن دبوچ کر ایک دم باہر کھینچ لیا۔

اِس کے ساتھ ہی جگ موہن کو ہوش آ گیا۔ آنکھیں کھُلتے ہی اُس کی نظریں اُس سانپ پر پڑیں جو سارنگ بابا کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ وہ ایک دم اُٹھ بیٹھا اور حیرانی سے سانپ کی طرف دیکھنے لگا۔

”حیران کیوں ہو رہے ہو؟“ سانگ بابا بولے۔ ”یہ تمہاری پُشپا ہے، جو ناگن کے روپ میں دوبارہ زندہ ہو کر تمہارے جسم سے باہر آئی ہے۔“

”اچھّا؟“ جگ موہن نے کہا۔ ”کیا یہ واقعی پُشپا ہے؟“

”پوچھ لو۔“ سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بوئے۔

جک موہن نے ناگن سے کہا۔ ”پُشپا بیٹی، کیا یہ سچ مُچ تُم ہی ہو؟“

اور سارنگ بابا کے ہاتھ میں جھولتی ہوئی ناگن نے یوں اپنا سر ہلایا جیسے اُس نے جگ موہن کی بات کا جواب ہاں میں دیا ہو۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے ایک پھنکار ماری جِس میں غصّہ یا غضب کا نہیں، محبّت کا اظہار تھا۔

”اب تُم کیا چاہتی ہو، بیٹی؟“ سارنگ بابا نے ناگن سے پوچھا۔

”میں اپنے قبیلے میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“

”جاؤ!“ سارنگ بابا نے کہا اور اُسے چھوڑ دیا۔

سارنگ بابا کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی وہ باہر کی طرف بڑھی اور جب آگ کے حلقے کے پاس پہنچی تو اُس نے مُڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے پھونک ماری۔ آگ کا حلقہ غائب ہو گیا اور پُشپا اُن سانپوں میں جا شامل ہوئی جو

وہاں اُسی کی خاطر آئے تھے۔ اُن کے درمیان پہنچے ہی پُشپا نے اِس طرح پھنکار ماری جیسے کوئی حکم دے رہی ہو۔ پھر وہ ایک طرف کو بڑھی اور سارے سانپ اُس کے حکم کی تعمیل میں اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ ذرا دیر بعد وہاں ایک سانپ بھی نہ رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے بابا جی؟" جگ موہن نے حیران ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں میرے دوست۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "پُشپا بیٹی اپنے قبیلے میں واپس گئی ہے۔"

"اپنے قبیلے میں واپس گئی!" جگ موہن اور بھی حیران ہو گیا۔ "مگر جب وہ یہاں آئی تھی تو اُس نے واپس اپنے قبیلے میں جانے سے اِنکار کر دیا تھا۔"

"اس وقت بات اور تھی، اب بات اور ہے۔" سارنگ بابا بولے۔ "اُس وقت وہ ایک لڑکی کے روپ میں تھی اور اب ناگن کے روپ میں ہے۔"

”کیا اب وہ ناگن کے روپ میں ہی رہے گی؟“ جگ موہن نے پوچھا۔ ”کیا میں پُشپا بیٹی کو دوبارہ اُس کے اصل روپ میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گا؟“

سارنگ بابا بولے۔ ”ابھی انتظار کرو میرے دوست اور دیکھو، کہ تمہاری آنکھیں کیا کیا تماشا دیکھتی ہیں!“

سردار کی حویلی میں

پُشپا کا تعلّق کولیہ قبیلے سے تھا اور سُورج ساکیہ قبیلے سے تھا۔ ساکیہ وہی قبیلہ تھا جس کے راج کمار ساکیہ منی گوتم بدھ نے ذات پات اور رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو نجات کی راہ دِکھائی تھی۔ گوتم بدھ کی ماں رانی مہامایا کا تعلّق کولیہ قبیلے سے تھا۔

یہ دونوں قبیلے ایسے تھے جو پُرانے زمانے سے ایک دوسرے کے خُون سے ہولی کھیلتے آئے تھے، اُن میں دوستی اور صلح کے عہد بھی ہوئے لیکن بہت کم عرصے

کے لیے۔ اُن میں دوستی اور صُلح برقرار رہی۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خُون کے پیاسے رہے۔

گوتم بُدھ اُس وقت شہر شہر، بستی بستی لوگوں کو صُلح اور آتشی کا پیغام دیتے پھر رہے تھے۔ وہ دیسالی میں تھے جب اُنہیں یہ خبر ملی کہ دریا کے پانی کی تقسیم کے سوال پر ساکیہ اور کولیہ قبیلے ایک دوسرے سے جنگ کرنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ گوتم بُدھ اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر فوراً وہاں پہنچے، دونوں قبیلوں کے سمجھ دار لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور اُن سے پوچھا۔

”اے لوگو! یہ بتاؤ کہ زمین زیادہ قیمتی ہے یا انسان کی جان؟“

دونوں قبیلوں کے لوگوں نے جواب دیا۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! انسان کی جان زمین سے زیادہ قیمتی ہے۔“

اِس پر گوتم بُدھ نے کہا۔ ”تُم نے ٹھیک کہا کہ انسان کی جان زمین سے زیادہ قیمتی

ہے۔ اب ایک بات اور بتاؤ۔ پانی زیادہ قیمتی ہے یا انسان کی جان؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ انسان کی جان پانی سے زیادہ قیمتی ہے۔“

اِس پر گوتم بُدھ نے کہا۔ ”تُم نے ٹھیک کہا کہ انسان کی جان پانی سے زیادہ قیمتی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ جب تُم خود جانتے اور مانتے ہو کہ انسان کی جان زمین اور پانی دونوں سے زیادہ قیمتی ہے تو پھر تُم زمین اور پانی کی خاطر انسانی جانیں ضائع کرنا کیوں چاہتے ہی؟“

گوتم بُدھ کی اِس بات کا اُن لوگوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ جنگ ٹل گئی اور دونوں قبیلوں کے درمیان صُلح ہو گئی۔

گوتم بُدھ تو دونوں قبیلوں کے درمیان صلح کرانے کے بعد چلے گئے مگر یہ قبیلے ایک تھوڑی سی مدّت اِس صلح اور دوستی پر قائم رہنے کے بعد پھر دُشمنی کی پرانی

ڈگر پر آ گئے۔ تب سے وہ برابر ایک دوسرے کے دُشمن چلے آ رہے تھے اور پھر کسی گوتم بُدھ نے اُن کے درمیان صلح کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

پُشپا اور سورج کے معاملے نے اِس دُشمنی کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ پُشپا کے سوئمبر کے بعد جب ساکیہ قبیلے نے کولیہ قبیلے پر حملہ کر کے اپنی بے عزّتی کا بدلہ لینا چاہا تھا، تو مُقابلے میں دونوں طرف کے کئی سوجوان کھیت رہے تھے۔

پھر جب کولیہ قبیلے کو یہ معلوم ہوا تھا پُشپا جگ موہن رِشی کی پناہ میں پہنچ گئی ہے اور سورج بھی زندہ بچ نکلا ہے تو اُنھوں نے جھگڑا ہمیشہ کے لیے چُکا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے اُنھوں نے سورج کی طرف سے ایک جعلی پیغام بھیج کر پُشپا کو ایک روز پہلے ہی بُلوا لیا اور جب پُشپا آئی تو اُسے جان سے مار دینے کے بعد اُس کی لاش جلا ڈالی اور اُس کی راکھ کو انومہ ندی میں بہا دیا۔ پھر جب سُورج وہاں پہنچا تو اُس کا بھی کام تمام کر ڈالا۔

پُشپا اور سورج کا خاتمہ کر کے کولیہ قبیلے نے اپنے خیال میں یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے

چُکا دیا تھا لیکن اُنہیں یہ معلوم نہ تھا کہ سارنگ بابا کی مہربانی سے پُشپا دوبارہ ایک ناگن کے رُوپ میں زندہ ہو جائے گی اور یہ ناگن اپنے قبیلے کی طرف یُوں آئے گی جیسے کوئی بادشاہ کسی قلعے پر دھاوا بولتا ہے۔ اور انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ ناگن اکیلی نہیں، ناگوں کی ایک فوج کے ساتھ آئے گی۔

پُشپا ناگن کے روپ میں ناگوں کی فوج کے ساتھ اپنے قبیلے میں پہنچی تو رات کا پچھلا پہر تھا۔ مرد، عورتیں، بالے، بُوڑھے اور جوان گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ پُشپا اُن کو موت کی نیند میں بدل دینا چاہتی تھی۔ اُس کے قبیلے والوں نے جو کُچھ اُس کے ساتھ کیا تھا، اُس کے نزدیک اُس کی سزا یہی ہو سکتی تھی۔ جِن لوگوں نے اُسے اور سورج کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا، اب وہ اُن سب کو موت کے اندھے کنویں میں پھینک دینا چاہتی تھی۔

وہ ناگوں کی فوج کے ساتھ سب سے پہلے اپنے باپ کی حویلی کی طرف بڑھی جس نے سوئمبر رچانے کے باوجود پُشپا کی شادی سُورج سے کرنے سے انکار کر دیا تھا

اور اُسی کے حکم پر قبیلے کے دوسرے لوگوں نے اُسے اور سورج کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مگر باپ کے کمرے کی دہلیز پر ہی ایک آواز نے اُس کا راستہ لیا۔

”پُشپا ہوش میں آؤ! وہ تمہارا باپ ہے!“

پُشپا رُک گئی اور اُس نے نظریں اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ دروازے میں اُس کی ماں کھڑی تھی۔ وہ ماں جو اُسے چھوٹی سی عُمر میں چھوڑ کر اس دُنیا سے چلی گئی تھی۔ پُشپا نے ایک پھنکار ماری، جیسے کہنا چاہتی ہو!

”تُم کیا چاہتی ہو، ماں؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تُم اپنے باپ کو معاف کر دو اور واپس چلی جاؤ۔“

اور پُشپا نے پھنکار کی صورت میں جواب دیا۔ ”میں تمہارا کہنا مان کر اپنے باپ کو معاف کر سکتی ہوں، مگر اِس کے ظُلم کی وجہ سے میں نے ہی نہیں، دوسروں نے بھی دُکھ اُٹھائے ہیں۔ اِس نے سورج کو قتل کرایا ہے، اور اِس نے میرے ساتھ

جو کُچھ کیا، اُس کی وجہ سے وہ جگ موہن رِشی ہر مہینے ایک خوف ناک عذاب سہتے رہے ہیں، جنہوں نے مُجھے اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ نہیں، میں اپنے باپ کو جگ موہن رِشی کے پاس لے جاؤں گی۔ وہاں سارنگ بابا اِس کے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔"

اس کے جواب میں کوئی آواز نہیں آئی۔ شاید پُشپا کی ماں کو اِس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ پُشپا نے نظریں اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ دروازے میں اُس کی ماں موجود نہ تھی۔ وہ پلٹ کر ناگوں کی اُس فوج کی طرف گئی جو اُس کے حکم کے انتظار میں تھی۔ اُس نے ایک زور کی پھنکار ماری۔ اِس پھنکار کے ذریعے اُس نے ناگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اُس کے باپ کو گرفتار کر لیں اور پھر اُسے جگ موہن رشی کی کُٹیا میں لے چلیں۔ پُشپا کا حکم پاتے ہی ناگ پھنکاریں مارتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔

پھنکاروں کے شور سے پُشپا کے باپ کی آنکھ کھلی تو اپنے سامنے ناگوں کی فوج دیکھ

کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ ناگ آگے بڑھ کر اُس سے چمٹ گئے اور پھر اُسے گھسیٹنے لگے جیسے چیونٹیاں کسی بھاری چیز کو مل کر گھسیٹتی ہیں۔

ناگوں کی پھنکار کے شور سے حویلی کے اندر موجود تمام لوگ جاگ اُٹھے، قبیلے کے کئی لوگ بھی بھاگے بھاگے حویلی کی طرف آئے مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ ہزاروں ناگ اُن کے بے ہوش سردار کو چیونٹیوں کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے ہیں تو وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگ گئے۔

پُشپا کی واپسی

نئے چاند کی پہلی رات تھی، جب پُشپا اور اُس کے ناگوں نے کولیہ قبیلے کے بے ہوش سردار کو جگ موہن رِشی کی کُٹیا کے سامنے لا کر ڈالا۔ پُشپا اُن کے ساتھ تھی۔ ناگ بے ہوش سردار کو کُٹیا کے سامنے ڈال کر ایک طرف ہٹ گئے تو پُشپا نے پھنکار ماری، جیسے انہیں واپس جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔ اُس کی پھنکار کے جواب میں تمام ناگوں نے سر جھکا کر پُشپا کو سلام کیا اور پھر وہاں سے چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد پُشپا سارنگ بابا سے پھنکار کی زبان میں کہنے لگی:

”باباجی! اپنی ماں کا کہنا مان کر میں مُجرم کو آپ کے سامنے لے آئی ہوں۔ اب اُس کے ساتھ انصاف کرنا آپ کا کام ہے۔“

سارنگ بابا کہنے لگے۔ ”تُم نے اچھّا کیا کہ اپنی ماں کا کہنا مان لیا اور اِسے یہاں لے آئیں۔ ماں وہ مقدّس ہستی ہے جو اِس دُنیا سے جا کر بھی اپنی اولاد کو یاد رکھتی ہے۔ اپنی اولاد کی بھلائی چاہتی ہے اور آڑے وقت میں اُس کی امداد اور رہنمائی بھی کرتی ہے۔ تمہاری ماں نے اپنا فرض ادا کر دیا، تُم بھی اپنا فرض ادا کر چُکیں اور اب ہم اپنا فرض ادا کریں گے۔“

پھر وہ مُجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”انوشا بیٹے! کُٹیا کے کونے میں اِن کینچلیوں کا ڈھیر لگا ہے جو جگ موہن نے اب تک بدلی ہیں۔ اُنہیں باہر لا کر ایک جگہ ڈھیر کر دو۔ شانی اُنہیں آگ لگا دے گا اور جب یہ سب جل کر راکھ ہو جائیں تو اُوشا بیٹی اِس راکھ کو احتیاط سے اُٹھا کر یہاں سے آئے۔ شاباش! جلدی کرو۔ یہ کام پُشپا بیٹی کے باپ کے ہوش میں آنے سے پہلے پہلے ہو جانا چاہیے۔“

میں نے کُٹیا کے کونے میں پڑی ہوئی کینچلیاں اُٹھائیں اور اُنہیں باہر لے جا کر کوئی پچاس ہاتھ کے فاصلے پر ڈال دیا۔ اِس کے بعد میں نے اپنے گلے میں جھولتے ہوئے شانی کو اُوشا کو تھمایا، اِس کے بعد بین سنبھالی اور اُوشا شانی کی گردن پکڑ کر کینچلیوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گئی۔

میں نے بین پہ شانی کی دُھن بجائی شروع کی۔ یہ وہی سوویں دُھن تھی جو سارنگ بابا نے ویری ناگ کے سنہری چشمے کی طرف جاتے ہوئے مُجھے سِکھائی تھی۔ شانی بہت دِنوں بعد اِس دُھن کو سُن رہا تھا۔ وہ ایک دم یوں جوش میں آ گیا جیسے کوئی بچّہ اپنا کھویا ہوا کھلونا پا کر جوش اور خوشی سے جھومنے لگتا ہے۔ میری بین کی لَے پر وہ اُوشا کے ہاتھ میں بے چینی سے بل کھاتا رہا۔ جیسے جیسے بین کی لَے تیز ہوتی گئی، شانی کی بے چینی بڑھتی گئی۔

پھر میرے اشارے پر اُوشا نے شانی کی گردن چھوڑتے ہوئے اُس کا مُنہ کینچلیوں کے ڈھیر کی طرف کر دیا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور کینچلیوں کا ڈھیر دھڑ دھڑ جلنے لگا۔

میں نے بین ہونٹوں سے ہٹا کر شانی کو اُوشا سے لے لیا اور پھر اُس کے بدن پر ہاتھ پھیر کر اُسے اپنے گلے میں ڈال لیا۔

ذرا دیر بعد ہی کینچلیوں کا ڈھیر راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ راکھ ٹھنڈی ہو گئی تو اُوشا نے اُس راکھ کو سمیٹا اور سارنگ بابا کے پاس لے گئی۔ بابا نے اُسے ایک گڑھے میں ڈلوا دیا جو اُن کی ہدایت کے مطابق جگ موہن رِشی نے ذرا دیر پہلے کھودا تھا۔ یہ گڑھا کُٹیا کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور کوئی پانچ ہاتھ لمبا، چار ہاتھ چوڑا اور تین ہاتھ گہرا تھا۔ اُوشا نے گڑھے میں اُتر کر راکھ کو خوب اچھّی طرح اُس کی تہہ میں پھیلا دیا۔ وہ اِس کام سے فارغ ہو کر باہر آئی تو سارنگ بابا پُشپا کے باپ کی طرف دیکھ رہے تھے، جو آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا تھا۔

رات ہو چکی تھی، مگر جگ موہن کی کُٹیا اور اُس کے ارد گرد دِن کے اُجالے کی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ سارنگ بابا کے ساتھ میں رات کے اندھیرے میں دِن کے سے اُجالے کا یہ سماں نہ جانے کتنی بار دیکھ چکا تھا۔

پُشپا کا باپ ہوش میں آیا تو سب سے پہلے اُس کی نظریں پُشپا پر پڑیں، جو اُس سے چند قدم کے فاصلے پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ حویلی کا وہ منظر اُس کی نگاہوں میں گھوم گیا، جب اُس نے ناگوں کی ایک فوج کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ ایک ہلکی سی چیخ اُس کے مُنہ سے نکلی، وہ اُٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ کہاں ہوں؟۔۔۔ تُم کون ہو؟"

سارنگ بابا نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، کولیہ سردار! تُم جگ موہن رِشی کی کُٹیا میں ہو۔ ہم تینوں، سارنگ، انوشا اور اُوشا جگ موہن کے مہمان ہیں اور یہ ناگن جو تُم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو، تمہاری اپنی بیٹی پُشپا ہے، جِس کے ساتھ تُم نے وہ کُچھ کیا ہے جو کوئی باپ کسی بیٹی سے نہیں کرتا۔ تُم نے اپنی چھوٹی آن کی خاطر پُشپا اور سورج ہی کا نہیں کولیہ اور ساکیہ قبیلے کے سینکڑوں جوانوں کا خون اپنی گردن پر لیا۔ تمہاری اِس حرکت کی وجہ سے جگ موہن ہر مہینے کے آخری دِنوں میں ایک

درد ناک عذاب سے دوچار ہوتے رہے۔ قدرت کی مہربانی سے اُن کے اِس عذاب کا خاتمہ ہوا اور اِس کے ساتھ ہی تمھاری بیٹی کو ایک نئی زندگی ملی مگر ایک ناگن کے روپ میں۔ وہ تُم سے تمھارے ظُلم کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ لیکن دُعا دو پُشپا کی ماں کو کہ اُس نے پُشپا کو ایسا نہیں کرنے دیا۔ وہ تمھیں ڈسنے کے بجائے یہاں سے آئی تا کہ تمھارے ساتھ انصاف ہو سکے۔

قدرت نے پُشپا کے سوئمبر کی صورت میں تمھیں وہ سنہری موقع دیا تھا جِس سے فائدہ اُٹھا کر تُم کولیہ اور ساکیہ قبیلے میں پھر سے دوستی قائم کر سکتے تھے، وہ کام کر سکتے تھے جو تُم سے پہلے گوتم بُدھ نے کیا تھا۔ تُم نے سُنا ہو گا کہ کئی سو سال پہلے جب یہ دونوں قبیلے دریا کے پانی کے سوال پر جنگ کرنے کو تیّار تھے تو گوتم بُدھ نے دونوں قبیلوں میں صُلح کرا دی تھی۔ سورج نے سوئمبر کی شرط جیتی تھی۔ تُم اِس شرط کے مطابق پُشپا اور سورج کی شادی کرا دیتے تو آج دونوں قبیلے امن اور دوستی سے رہ رہے ہوتے۔ مگر تُم نے امن کے بجائے جنگ اور دوستی کے بجائے دُشمنی کا راستہ اختیار کیا۔ تمھاری وجہ سے کتنے ہی انسانوں کا خون بہا ہے۔ آج تُم

سے اس خون کا حساب لیا جائے گا۔

تُم ایسے مُجرم ہو جس کے ساتھ کوئی رعایت، کوئی نرمی نہیں کی جا سکتی۔ تُم اِس لائق ہو کہ تمہارا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کے آگے ڈال دیا جائے مگر دُعا دو اپنی بیوی کو کہ اُس کی وجہ سے قدرت نے تمہیں موقع دیا ہے کہ چاہو تو اپنی سزا کو اپنی آخری نیکی میں تبدیل کر سکتے ہو۔"

سارنگ بابا کے یہ الفاظ سُن کر پُشپا کے باپ نے خوف بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ سارنگ بابا کہنے لگے۔

"تُم نے پُشپا کی لاش جلوا کر انومہ ندی میں بہا دی تھی، مگر قدرت کی اَن دیکھی طاقتوں نے اُسے پھر سے زندگی دے دی۔ یہ زندگی ناگن کے روپ میں ہے۔ پُشپا کو اپنا اصل روپ صرف اُس صورت میں مل سکتا ہے جب علاوہ اور باتوں کے پُشپا تمہارے خُون سے غسل کرے۔ بتاؤ کیا تُم اِس کے لیے تیّار ہو؟ اپنی بیٹی کے ساتھ پہلی اور آخری نیکی کرنے پر آمادہ ہو؟"

”میں۔۔۔میں۔۔۔کُچھ نہیں سمجھا بابا جی!“

”ہمارے لیے یہ کُچھ مُشکل نہیں کہ ہم تمہارے جسم کا سارا خون اِس گڑھے میں بھر دیں۔ پُشپا اُس میں نہائے اور پھر سے انسانی جسم میں آ جائے۔ مگر ہم تمہیں اپنی بیٹی کے ساتھ آخری نیکی کرنے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ اِس طرح پُشپا کو پھر سے انسانی جسم مل جائے گا؟“

”ہم جوگی کچّی بات نہیں کیا کرتے۔“ سارنگ بابا نے کہا۔

”تو۔۔۔تو۔۔۔پھر میں حاضر ہوں۔“ پُشپا کے باپ نے رُک رُک کر کہا۔

یہ کہہ کر وہ گڑھے کے کنارے لیٹ گیا۔ سارنگ بابا نے پُشپا کو اشارہ کیا اور وہ رینگتی ہوئی گڑھے میں اُتر گئی۔ اُس کے ساتھ ہی سارنگ بابا نے مُجھے اشارہ کیا۔ میں نے اُٹھ کر بین سنبھالی اور مہا تالی چھیڑ دی۔

مہا تالی کے عجیب و غریب اثر میں اِس سے پہلے دیکھ چُکا تھا۔ یہاں مہا تالی نے یہ

اثر دِکھایا کہ پُشپا کے باپ کے جسم سے سارا خون کھِنچ کھِنچ کے گڑھے میں جانے لگا۔ پُشپا کا باپ چُپ چاپ گڑھے کے کنارے بیٹھا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور نہ پھڑک رہا تھا، اور خون تھا کہ اُس کے جسم سے نکل نکل کر گڑھے میں جا رہا تھا اور گڑھے کے اندر پُشپا اُس خون میں نہا رہی تھی۔

ٹھیک آدھی رات کے وقت میں نے بین ہونٹوں سے ہٹائی اور اِس کے ساتھ ہی پُشپا ایک نوجوان لڑکی کے روپ میں گڑھے سے باہر آ گئی۔ سارنگ بابا نے کہا۔

”ہمارا کام ختم ہوا، پُشپا بیٹی۔ تمہارے باپ نے تمہارے لیے اپنا خون دے کر اپنے پچھلے ظُلم کی تلافی کر دی ہے۔ اب اِسے واپس اپنے قبیلے میں لے جاؤ اور اِس کی آخری رسمیں اُسی شان سے ادا کرو جیسے ایک کولیہ سردار کا حق ہے۔“

پُشپا نے پلٹ کر اپنے باپ کی لاش کو دیکھا اور پھر ایک دم اُس سے لپٹ کر رونے لگی۔ کُچھ بھی ہو، آخر وہ اُس کا باپ تھا۔ اُس نے اپنے خُون کی قُربانی دے کر اپنی بیٹی کے ساتھ پہلی اور آخری نیکی کی تھی اور اُس کی یہ نیکی اس کی یہ نیکی اس کے

پچھلے سب ظلموں سے بھاری تھی! پُشپا خاصی دیر تک اپنے باپ کی لاش پر لپٹی روتی رہی۔ جب اُس کے دِل کا بُوجھ کُچھ ہلکا ہوا تو وہ لاش کو واپس قبیلے میں لے گئی۔ قبیلے والے اپنے سردار کی لاش دیکھ کر اتنے حیران نہیں ہوئے جتنی حیران نہیں ہوئے جتنی پُشپا کو زندہ دیکھ کر ہوئی۔ بات ہی کُچھ ایسی تھی۔ جس پُشپا کی لاش جلا کر انومہ ندی میں بہا دی گئی تھی، وہی پُشپا جیتی جاگتی اُن کے سامنے موجود تھی۔

پُشپا نے اپنے باپ کی آخری رسمیں بڑی شان سے ادا کیں۔ اِس موقع پر اُس نے ساکیہ قبیلے کے لوگوں کو بھی بُلوایا اور اُن کی موجودگی میں اپنے باپ کی کمان اور تلوار کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔ یہ گویا اِس بات کا اعلان تھا کہ اب کولیہ قبیلہ کبھی ساکیہ قبیلے پر تلوار نہیں اُٹھائے گا اور کولیہ قبیلے کے کسی جوان کے تیر کمان کا رُخ ساکیہ قبیلے کی طرف نہیں ہو گا۔

ان رسموں میں سارنگ بابا، اُوشا، میں اور جگ موہن بھی شامل ہوئے۔ رسموں

کے بعد پُشپا کے باپ کی اَرتھی مرگھٹ کی طرف جا رہی تھی تو میں سورج کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ جوان جس نے پُشپا کے سوئمبر کی شرط جیتی تھی۔ جس کے ساتھ پُشپا کی شادی کرنے سے پُشپا کے باپ نے اِس لیے انکار کر دیا تھا کہ کولیہ اور ساکیہ قبیلوں کے درمیان دُشمنی کی وجہ سے ہر طرح کے رشتے ناتے بند تھے۔ جسے پُشپا کے باپ کے حکم سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔ پُشپا دوبارہ زندہ ہو گئی تھی مگر سورج کا ذکر کِسی زبان پر نہیں آیا۔

مگر یہ معاملہ ایسا تھا جہاں سارنگ بابا انوشا اور جگ موہن قدرت کی اَن دیکھی طاقتوں کے سامنے بے بس تھے۔ پُشپا دوبارہ انسانی صورت میں اِس لیے آ گئی تھی کہ جنگ موہن رِشی نے اتّفاق سے وہ پانی پی لیا تھا جن میں پُشپا کی لاش کی راکھ ملی ہوئی تھی، مگر سورج کی راکھ کو کوئی جگ موہن نصیب نہ ہو سکا تھا۔ شاید قدرت نے جس طرح کولیہ قبیلے کے سردار کے خون کی بھینٹ لی تھی، اِسی طرح ساکیہ قبیلے کے بہترین جوان سورج کے خون کا بھی نذرانہ لیا تھا۔ اِس طرح کولیہ اور ساکیہ قبیلے کی دوستی ایک ایسا پودا تھا جسے دونوں قبیلوں نے اپنا اپنا خون دیا تھا۔

پُشپا کے باپ کی آخری رسموں سے فارغ ہونے کے بعد ہم چند دِن اور جگ موہن کے پاس ٹھہرے اور پھر آگے چل دیے۔

کپل وستُو کا کُتّا

ہم انومہ ندی کے کنارے جگ موہن رِشی کی کُٹیا سے چلے اور سفر کرتے ہوئے کپل وستُو پہنچے۔ یہ وہ شہر تھا جو کبھی گوتم بُدھ کے باپ راجا شدھودھن کی ریاست کی راجدھانی تھا۔ اِسی شہر میں راج کمار گوتم نے ایک بوڑھے، ایک بیمار اور ایک لاش کو دیکھ کر دُنیا چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور عیش و عشرت کی زندگی سے مُنہ موڑ کر فقیروں کی زندگی اختیار کرلی تھی۔

گوتم بُدھ کی اِس جنم بھومی میں کیشب نام کا ایک شخص سارنگ بابا کا پُرانا واقِف

تھا۔ یہ شخص کسی وقت بہت بڑا سوداگر ہوا کرتا تھا اور اُس کا کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مگر اتنے بڑے کاروبار اور ڈھیروں دولت کا مالک ہونے کے باوجود وہ ایک پیسہ تک خیرات نہ کرتا تھا۔ بہت سے سادھوؤں اور جوگیوں نے اُسے دان پُن کے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ پھر اتّفاق سے ایک بار ایسا ہوا کہ کیشب اور سارنگ بابا ایک ہی کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ اُس کشتی میں کئی اور مسافر بھی تھے۔ اچانک کشتی ایک بھنور میں جا پھنسی۔ سب مسافر اپنی اپنی جانیں بچانے کے لیے دریا میں کُود گئے۔ کیشب نے مسافروں سے کہا کہ جو شخص اُس کی جان بچائے گا، اسے مُنہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ مگر وہ لوگ جانتے تھے کہ کیشب پرلے درجے کا کنجوس اور لالچی ہے، اُس کی زبان کا کوئی اعتبار نہیں، اِس لیے کسی نے اُس کی طرف توجّہ نہ دی۔ آخر سارنگ بابا نے اُس کی جان بچائی اور پھر اُسے بتایا بھی کہ تمہاری دولت اِس دُنیا میں تمہارے کام نہ آئی تو اگلی دُنیا میں کیا کام آئے گی۔

اور وہ کیشب جواب تک سادھوؤں اور جوگیوں کی باتوں میں نہ آیا تھا، سارنگ بابا

کی ایک ہی بات نے اُس کی کایا پلٹ دی۔ کپل وستُو واپس پہنچتے ہی اُس نے غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لیے اپنی تھیلیوں کے مُنہ کھول دیے۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے مسافروں کے لیے ایک بہت بڑی سرائے بنوائی۔ اِس سرائے میں قیام کرنے والے لوگوں کا سارا خرچ کیشب نے اپنے ذمّے لے رکھا تھا۔ وہی لوگ جو کیشب کو کنجوس مکھی چوس کہتے تھے، اب دِن رات اُس سخاوت اور دریادِلی کے گُن گاتے تھے۔

کیشب کی یہ سرائے بہت وسیع تھی اور اُس میں کئی سو مسافر ٹھہر سکتے تھے۔ سرائے کے ساتھ ہی کیشب کا عالی شان مکان تھا جو خوب صورتی اور سجاوٹ میں کسی راجا سے کم نہ تھا۔ اِس مکان کے پچھواڑے ایک خوب صورت باغ تھا۔ سرائے میں مسافروں کی خدمت کے لیے بیسیوں نوکر چاکر تھے اور مکان کے پچھواڑے باغ کی دیکھ بھال کے لیے کئی درجن مالی رکھے گئے تھے۔ مگر کیشب اپنے مکان میں صرف ایک نوکر کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بیوی مدّت ہوئی مر چکی تھی اور اِس کے بعد اُس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

ہم سیدھے کیشب کی سرائے میں پہنچے۔ سرائے کے نوکروں نے فوراً ہمیں ایک صاف سُتھرے کمرے میں ٹھہرایا اور کیشب کو ہمارے آنے کی خبر کی۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ سارنگ بابا کے آنے کی خبر سُن کر کیشب بھاگا بھاگا آئے گا اور ہمیں سرائے سے اپنے مکان میں لے جائے گا۔ مگر ہوا یہ کہ کیشب کے بجائے اُس کا نوکر، جس کا رنگ توے کی طرح سیاہ اور آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں، آیا اور بڑے روکھے پھیکے انداز میں کہا!

"میرے مالک کو آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی ہے مگر افسوس ہے کہ بیماری کی وجہ سے وہ خود آپ کے پاس نہیں آسکتے۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔" سارنگ بابا نے بے پرواہی سے کہا۔

"میرے مالک بیماری کی وجہ سے باہر بہت کم نکلتے ہیں۔" نوکر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں ہی اُنہیں تھوڑا بہت باغ میں ٹہلا لیتا ہوں۔ اُن کے لیے کھانا وغیرہ بھی میں ہی پکاتا ہوں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو وہ میرے سوا اور کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا

کھاتے ہی نہیں۔“

”بڑی اچھّی بات ہے، بڑی اچھّی بات ہے۔“ سارنگ بابا نے کہا۔

”آپ جب تک جی چاہے یہاں رہیں۔“ نوکر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”آپ کو کسی بات کی تکلیف نہیں ہو گی اور سرائے کے نوکر آپ کی ہر ضرورت کا اِس طرح خیال رکھیں گے جیسے وہ آپ کے گھر کے نوکر ہیں۔۔۔۔۔۔۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ سارنگ بابا نے سوال کیا۔

”مُجھے سیوا کہتے ہیں۔“ نوکر نے جواب دیا۔ ”بڑا اچھّا نام ہے۔“ سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور مُجھے اُمّید ہے کہ تُم اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے اپنے مالک کی سیوا کرتے ہوئے۔ ہمیں تمہارے مالک کی بیماری کا سُن کر دُکھ تو بہت ہوا ہے مگر ہم اُنہیں اِس بیماری میں کوئی اور تکلیف دینا نہیں چاہتے۔ تم اُنہیں ہماری طرف سے ایک بار پھر سلام کہہ دینا اور یہ بھی کہہ دینا وہ بیماری سے زیادہ پریشان

نہ ہوں۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔"

سارنگ بابا کے یہ الفاظ سُن کر سیوا نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سارنگ بابا نے اِن الفاظ کے ذریعے ایک سیدھی سادی بات کہی ہے یا اِن کے پیچھے کوئی خاص مطلب چھُپا ہوا ہے۔ مگر اُس نے زبان سے کُچھ نہیں کہا۔ ذرا سا جھُک کر سارنگ بابا کو سلام کیا اور پھر ایک اُچٹتی ہوئی نظر مُجھ پر اور اُوشا پر ڈالتا ہوا واپس چلا گیا۔

سیوا کے جانے کے بعد سارنگ بابا کُچھ دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے۔ "ہمیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہمارا دوست اِس حال میں ہو گا۔"

اتنا کہہ کہ سارنگ بابا پھر خاموش ہو گئے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دوست کیشب کے بارے میں بہت فِکر مند ہیں، لیکن کسی وجہ سے اِس کا اظہار کرنا نہیں چاہتے۔

وہ دِن تو ہم نے جیسے تیسے گزارا، مگر اگلے دِن شام کے قریب سارنگ بابا ہمیں ساتھ لے کر سرائے سے نکلے اور اُس باغ کی سیر کو چل دیے جو کیشب کے عالی شان مکان کے پچھواڑے تھا اور جس کی دیکھ بھال کے لیے درجنوں مالی مقرّر تھے۔

اِس باغ میں ہم نے ایک عجیب تماشا یہ دیکھا کہ سیوا ایک کُتّے کو باغ میں ٹہلاتا پھر رہا ہے۔ کُتّا خاصی عُمر کا معلوم ہوتا تھا اور اُس کی رفتار بھی بہت سُست تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک ایک قدم بڑی کوشش سے اُٹھا رہا ہے۔ ہر دو چار قدم چلنے کے بعد وہ رحم طلب نگاہوں سے سیوا کی طرف دیکھتا مگر سیوا کی انگاروں جیسی لال لال آنکھوں کو دیکھ کہ پھر سر جھُکا کر قدم اُٹھانے لگتا۔

ہم سیوا کو دیکھتے ہی ایک گھنے کُنج میں ہو گئے تھے۔ جب تک سیوا باغ میں کُتّے کو ٹہلاتا رہا، ہم اُس کُنج میں کھڑے رہے اور جب وہ کُتّے کو واپس مکان میں لے گیا تو اُس کُنج سے نکلے اور واپس سرائے میں آ گئے۔

سرائے میں آ کر سارنگ بابا نے مُجھ سے یا اُوشا سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ میں نے آج تک انہیں اتنا فکر مند نہیں دیکھا تھا۔ ساری رات انہوں نے اِسی پریشانی میں گزاری۔ شام سے صُبح تک وہ کمرے کی دیوار سے پیٹھ لگائے اور پاؤں پسارے کُچھ سوچتے رہے۔

صُبح ہوئی تو سارنگ بابا نے سرائے کے ایک نوکر کے ہاتھ کیشب کو پیغام بھجوایا کہ تُم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ یا تو تُم خود سرائے میں آنے کی تکلیف کرو یا ہم آجاتے ہیں۔

اِس پیغام کے جواب میں سیوا سرائے کے نوکر کے ساتھ ہی چلا آیا اور سارنگ بابا سے کہنے لگا۔ "میں نے کل آپ سے عرض کیا تھا کہ میرے مالک بیماری کی وجہ سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔"

سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں تُم نے بتایا تو تھا، مگر ہمیں یہ بتانا یاد نہیں رہا تھا کہ ہم اتنی دور سے کپل وستُو صرف تمہارے مالک سے ملنے آئے

ہیں۔ اور یہ بات کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اُن سے ملے بغیر چلے جائیں۔"

سیوا یہ سُن کر سوچ میں پڑ گیا، پھر کہنے لگا۔ "بہت اچھّا۔ آپ دوپہر کے وقت آ جایئے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سارنگ بابا پھر خاموش ہو گئے۔ میں سیوا کے بات کرنے کے انداز پر غور کرتا رہا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے اِس بات کا فیصلہ کرنا کیشب کا نہیں اُس کے نوکر سیوا کا کام ہے کہ کیشب کو کِس سے ملنا چاہیے اور کِس سے نہیں!

دوپہر کے وقت ہم کیشب کے مکان پر پہنچے۔ بڑے دروازے پر سیوا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سیدھا ہمیں مہمانوں کے کمرے میں لے گیا اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا۔ "آپ یہاں تشریف رکھیں۔ مالک تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔"

ہم کُرسیوں پر بیٹھ گئے اور اِرد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ کمرے میں سے ایسی بُو آ رہی تھی جیسے اُس کو مدّتوں بعد کھولا گیا ہو۔

خاصی دیر بعد کیشب کمرے میں آیا، لیکن سیوا کے ساتھ نہیں، اکیلا ہی۔ ایک ہاتھ میں اُس نے لاٹھی تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں کُتّے کے پٹّے سے بندھی ہوئی ایک زنجیر کا سِرا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ کُتّا اُس کے آگے یا پیچھے نہیں، بلکہ اُس کے قدموں کے ساتھ قدم ملاتا ہوا اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کیشب کی رنگت ہلدی کی طرح زرد تھی اور اُس کی لڑکھڑاہٹ سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اب گِرا کہ اب گِرا۔ اِس کے برعکس کُتّا بہت صحت منداور ہٹّا کٹّا تھا اور اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں۔

سارنگ بابا آگے بڑھ کر اپنے دوست سے لپٹ گئے اور اُسے سہارا دیتے ہوئے کرسی تک لائے۔ وہ کُرسی میں دھنس گیا اور کُتّا اُس کی پنڈلیوں سے چپک کر بیٹھ گیا۔ میں نے اور اُوشا نے کیشب کو سلام کیا۔ سارنگ بابا کہنے لگے۔

"یہ اپنے بچّے ہیں، انوشا اور اُوشا۔"

کیشب نے میرے گلے میں جھولتے ہوئے شانی کی طرف کسی قدر حیرانی سے

دیکھا اور کہنے لگا۔ "یہ اِس کے گلے میں سانپ کیسا ہے؟"

"یہ شانی ہے۔" سارنگ بابا بولے۔ "انوشا کا بھائی۔"

کیشب نے کُچھ کہنے کے لیے زبان کھولی مگر اُسی وقت کُتّے کی ہلکی سی آہٹ کی آواز آئی۔ کیشب نے سہمے ہوئے انداز سے کُتّے کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

"یہ تمہاری حالت کیا ہو گئی ہے، میرے دوست؟" سارنگ بابا بولے۔ "تُم تو چلتے پھرتے مُردے نظر آتے ہو! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

کیشب نے زبان کھولنے سے پہلے ایک بار پھر کُتّے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کُچھ نہیں سارنگ جی۔ میری ظاہری حالت پر نہ جایئے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سیوا سچ مُچ میری بڑی خدمت کرتا ہے۔ میری اپنی اولاد ہوتی تو وہ بھی میری اِس طرح دیکھ بھال نہ کرتی۔"

یہ کہہ کر کیشب نے پھر کُتّے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”کیوں؟ میں نے ٹھیک کہا نا؟“

سارنگ بابا کہنے لگے۔ ”یہ تو بڑی خُوشی کی بات ہے، میرے دوست کہ تمہیں سیوا جیسا نوکر ملا، لیکن آدمی آخر آدمی ہے۔ کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ تُم نے سرائے میں اتنے آدمی رکھے ہوئے ہیں، باغ کی دیکھ بھال کے لیے درجنوں مالی رکھ چھوڑے ہیں، پھر اپنی خدمت کے لیے دو چار آدمی اور کیوں نہیں رکھ لیتے؟ اِس طرح سیوا کا بوجھ ہلکا ہو گا۔ تمہیں بھی زیادہ آرام ملے گا اور سیوا کو بھی۔“

کیشب نے ایک بار پھر کُتّے کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ ”آپ سیوا کو نہیں جانتے۔ وہ تو تھکنا جانتا ہی نہیں۔ وہ جس لگن اور محنت سے میری سیوا کرتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ سو نوکر مل کر بھی سیوا کا مُقابلہ نہیں کر سکتے۔ سیوا سچ مُچ سیوا ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔“

یہ کہہ کر کیشب نے پھر کُتّے کی طرف دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔ ''کیوں؟ میں نے ٹھیک کہا نا؟''

اور کُتّا خوش ہو کر کیشب کے پاؤں چاٹنے لگا۔

خوف ناک جوگی

سرائے میں واپس آ کر سارنگ بابا نے مُجھ سے پوچھا۔ ”انوشا بیٹے! تُم نے کُچھ دیکھا؟ کُچھ محسوس کیا؟“

میں نے جواب میں کہا۔ ”بابا جی! کل جب شام کو ہم باغ میں گئے تھے اور سیوا اُس کُتّے کو لے کر باغ میں نکلا تھا تو کُتّا ایک ایک قدم بڑی کوشش سے اُٹھا رہا تھا اور دو چار قدم چلنے کے بعد رحم طلب نگاہوں سے سیوا کی طرف دیکھتا تھا، مگر سیوا کی انگاروں جیسی لال لال آنکھیں دیکھ کر پھر سر جھکا کر قدم اُٹھانے لگتا تھا۔

لیکن آج جو کُتّا کیشب کے ساتھ تھا، وہ دیکھنے میں تو کل والے کُتّے کی ہی طرح تھا مگر تھا بہت صحت مند اور ہٹّا کٹّا، اور اُس کی آنکھیں بھی انگاروں کی طرح سُرخ تھیں۔"

"جانتے ہو اِس کا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب تو میں کُچھ نہیں سمجھا، بابا جی!"

"میں بتاتا ہوں۔" سارنگ بابا بولے۔ "اس کا مطلب یہ ہے، کہ کل جو کُتّا تُم نے دیکھا تھا وہ ہمارا دوست کیشب تھا اور آج جو کُتّا تُم نے دیکھا، وہ کیشب کا نوکر سیوا تھا۔"

"کیا!" میں نے حیرانی سے کہا۔ اُوشا بھی حیرت بھری نگاہوں سے سارنگ بابا کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی زبان سے نکلا!

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

”یہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے، اُوشا بیٹی۔ اور ابھی تو تُم نے صرف اتنا کُچھ ہی دیکھا ہے۔ آگے نہ جانے کیا کُچھ دیکھو گی۔“

پھر سارنگ بابا مُجھ سے کہنے لگے۔ ”تُم نے دیکھا نہیں، انوشا بیٹے کہ ہمارا دوست بات کرنے سے پہلے کُتّے کی طرف دیکھتا تھا، بات کر کے پھر کُتّے کی طرف دیکھتا تھا اور بات کرتے کرتے کُتّے کی غرّاہٹ سُن کر خاموش ہو جاتا تھا۔“

”ہاں بابا جی!“ میں نے کہا۔ ”یُوں لگتا تھا جیسے کیشب جی کُتّے سے اجازت لے کر ہی زبان کھولتے تھے۔“

”ہاں بیٹے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس سیوا کی صورت میں ہمارے دوست پر کوئی بلا سوار ہو گئی ہے، جس نے اُسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ یہ بلا کبھی کیشب کو کُتّا بنا دیتی ہے اور کبھی خود کُتّا بن جاتی ہے۔ ہمیں اپنے دوست کو اِس بلا کی گرفت سے آزاد کرانا ہے، لیکن اِس سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ یہ بلا کیا ہے، کیا چاہتی ہے اور کیوں چاہتی ہے؟“

اتنا کہہ کر سارنگ بابا خاموش ہو گئے اور کُچھ سوچنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے سر اُٹھایا اور کہنے لگے۔ ”سُنو انوشا بیٹے! تُم کیشب کے مکان میں جاؤ گے اور وہاں رہ کر دیکھو گے کہ وہاں کیا کچھ ہوتا ہے، سیوا کیا کُچھ کرتا ہے اور کیشب پر کیا کُچھ بیتتی ہے۔ لیکن ابھی تمہیں صرف دیکھنا ہے، کرنا کُچھ نہیں۔“

”جیسے آپ کا حکم، بابا جی۔“ میں نے کہا۔ ”مگر یہ تو بتایئے، اگر اُس نے مُجھے دیکھ لیا تو؟“

'ایسا موقع ہی نہیں آئے گا، میرے بیٹے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”اب کے تُم اپنی طاقت کا ایک نیا روپ دیکھو گے۔ سب تمہارے سامنے ہوں گے، مگر تُم کسی کے سامنے نہیں ہو گے۔ جاؤ، اور قُدرت جو کُچھ دِکھائے، خاموشی سے دیکھو!“

سارنگ بابا کا حکم پاتے ہی میں آنکھ جھپکتے میں کیشب کے عالی شان مکان میں جا پہنچا اور کوئی تین دِن رات وہاں رہ کر یہ دیکھتا رہا کہ سیوا کیا کرتا ہے اور کیشب پر کیا کُچھ بیتتی ہے۔ میں نے وہاں جو کُچھ دیکھا، وہ اِس قدر خوفناک اور رونگٹے

کھڑے کر دینے والا تھا کہ اُس پر یقین کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تین دِن اور تین راتیں کیشب اور سیوا کو قریب سے دیکھنے کے بعد مُجھے معلوم ہوا کہ سیوا کون ہے، کیا چاہتا ہے اور کیوں چاہتا ہے۔

وہ ایک ایسا جوگی تھا جسے کایا کلپ کا عِلم سیکھنے کے چکّر نے غَلَط راستے پر ڈال دیا تھا۔ اُس نے بہت سے جوگیوں کے پاس رہ کر یہ علم سیکھنے کی کوشش کی تھی کہ اپنی اور دوسروں کی روح کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں کس طرح ڈالا جا سکتا ہے۔ اِس کے لیے اُس نے بڑی ریاضتیں کی تھیں۔ وہ پہروں، بغیر سانس لیے، پانی کے اندر رہ سکتا تھا۔ کئی کئی دِن تک سانس روک کر مُردے کی طرح لیٹا رہ سکتا تھا۔ اِسی طرح کی ریاضتوں اور مختلف جوگیوں کی مہربانی کی بدولت وہ اِس قابل ہو گیا تھا کہ اپنی روح جس انسان، حیوان، چرند، پرند کے جسم میں چاہے، ڈال سکے، مگر اُسے اُس وقت تک تسلّی نہ ہو سکتی تھی جب تک وہ دوسروں کی روحوں کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں مُنتقل نہ کر سکے۔ جوگیوں سے اُس نے جو کُچھ حاصل کیا تھا، اُسے وہ کافی نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے خود اِس بات کی کوشش شروع

کر دی کہ اُسے دوسروں کے جِسموں اور روحوں پر اختیار حاصل ہو جائے۔ پہلے اُس نے جنگل کے جانوروں پر تجربے کیے، اور آخر کار اُسے اِس حد تک کامیابی حاصل ہو گئی کہ وہ ہرن کی جان خرگوش کے جسم میں اور خرگوش کی جان ہرن کے جسم میں مُنتقل کر دیتا تھا۔ وہ چوہے کو بلّی اور بلّی کو چڑیا بنانے میں بھی ایک حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔ جانوروں کی دُنیا میں کِسی قدر کامیابی حاصل کر لینے کے بعد اب اُس نے انسانوں کی دُنیا کا رُخ کیا تھا اور انسانوں کی دُنیا میں اُس کے خوف ناک تجربوں کا پہلا نشانہ کپل وستُو کا کیشب بنا تھا۔

وہ ایک مسکین سے نوکر کے روپ میں کیشب کے پاس آیا اور چند ہی دِنوں میں کیشب کو اپنے جال میں اِس حد تک جکڑ لیا کہ کیشب اُس کی مرضی کے خلاف اپنی زبان تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ سیوا ہی کے کہنے پر اُس نے اپنے مکان سے تمام نوکروں کو ایک ایک کر کے رُخصت کر دیا تھا۔

مگر کایا کلپ کا یہ معاملہ ایسا سیدھا سادا نہ تھا کہ کیشب کو اپنے جال میں جکڑ لینے یا

مکان سے تمام نوکروں کو نکلوا دینے سے حل ہو جاتا۔ سیوا کوشش کے باوجود اپنی روح کیشب کے بدن میں اور کیشب کی روح اپنے جسم میں مُنتقل نہ کر سکا تھا۔ آخر ہار کر اُس نے کیشب کے پالتو کُتّے کو اپنے خوف ناک تجربے میں شامل کر لیا۔ اِس سے اُسے صرف اِس حد تک کامیابی ہوئی تھی کہ کبھی وہ کیشب کی روح اُس کُتّے کے جسم میں ڈال دیتا تھا اور کبھی اپنی روح کُتّے کے جسم میں۔ اِس طرح کبھی تو وہ کیشب کو کُتّا بنا دیتا تھا اور کبھی خود کُتّا بن جاتا تھا۔

سیوا کے لیے خود کُتّا بننا اور کُتّے سے پھر انسانی جسم میں آنا بالکل ایسا تھا جیسے وہ ایک لباس اُتار کر دوسرا لباس پہن لے۔ مگر جب وہ کیشب کی روح کو کُتّے کے جسم میں لے جانے یا اُسے کُتّے سے دوبارہ کیشب بنانے کا عمل کرتا تھا تو کیشب کی جان پر بن جاتی تھی۔ اُسے اِس تکلیف دہ حالت سے گزرنا ہوتا تھا جو کسی انسان پر مرتے وقت طاری ہوتی ہے۔ وہ تڑپتا، پھڑکتا اور دِل ہلا دینے والی چیخیں مارتا مگر سیوا کے دِل پر اُس کے تڑپنے پھڑکنے اور چیخوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی اُس نے ایسا بندوبست بھی کر رکھا تھا کہ کیشب کی یہ چیخیں کسی شخص

کے کانوں تک نہ پہنچ پائیں۔

سیوا نے کیشب کو جتا دیا تھا کہ ”ظاہری طور پر تُم میرے مالک اور میں تمہارا نوکر سہی، مگر میری نظروں میں تمہاری حیثیت اِس کُتّے سے زیادہ نہیں جس کا رُوپ تُم دِن رات میں کئی کئی بار دھارتے ہو۔ یاد رکھو! اگر تُم نے کسی شخص کے سامنے اِس بارے میں زبان کھولی تو میں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کُتّا بنا دوں گا۔“

سیوا کی اِس دھمکی نے کیشب کو جیتے جی مار دیا تھا، اور وہ ایک چلتا پھرتا مُردہ بن کر رہ گیا تھا۔ سرائے میں آنے والے مسافر اُس کے گُن گاتے تھے، اُس کا باغ شہر بھر کے لیے سیر کی جگہ تھی اور تمام لوگ اُس کی تعریفوں کے پُل باندھتے نہ تھکتے تھے۔ مگر خود کیشب پر کیا گزر رہی تھی، یہ کُچھ وہی جانتا تھا۔

کیشب کو پوری طرح اپنے بس میں کر لینے کے باوجود سیوا اسے ایک پل کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑتا تھا۔ شام سے صُبح تک وہ کیشب کو کُتّا بنا کر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور دِن کے وقت خود کُتّا بن کر اُس سے چمٹا رہتا تھا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ کیشب کو اِس خوف ناک جوگی کے پنجے سے کیسے نکالا جائے!
سارنگ بابا کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے کے حق میں تھے کہ کام بھی بن جائے اور کسی کے ساتھ زیادتی بھی نہ ہو۔ ابھی سارنگ بابا نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا تھا کہ قدرت نے خود ہی مہربان ہو کر اُن کے لیے ایک راستہ پیدا کر دیا۔ کیشب کے عالی شان مکان کے پچھواڑے جو باغ تھا، وہ لوگوں کے لیے سیر گاہ تو تھا ہی، لڑکے بالے بھی اکثر کھیلتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے، تیسرے پہر کا وقت تھا۔ باغ کے ایک کونے میں دس بارہ لڑکے بندروں کی طرح درختوں کی شاخوں پر چڑھے ہوئے کوئی کھیل کھیل رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکا درخت کی ایک شاخ پر سے پھِسل کر گِرا اور گِرتے ہی مر گیا۔

لڑکے کے ماں باپ کو خبر ہوئی تو اُن کی دُنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ اُن کا اِکلوتا بیٹا تھا۔ وہ روتے پیٹتے لڑکے کی لاش باغ اُسے لے جا رہے تھے تو اُن کی چیخیں سُن سُن کر سیوا بھی وہاں آ پہنچا۔ لڑکے کی لاش دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک پُر اسرار چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے لڑکے کے باپ سے کہا!

”روؤ نہیں۔ تمہارا بچّہ پھر سے زندہ ہو سکتا ہے۔ میں چند ٹوٹکے جانتا ہوں۔ اِسے میرے کمرے میں لے چلو۔ میں کوشش کروں گا کہ اِسے پھر سے زندگی مل جائے۔“

ظاہری طور پر بچّے میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی تھی، مگر غم زدہ ماں باپ کے لیے سیوا کے یہ الفاظ اندھیرے میں روشنی کی ایک کِرن تھے۔ اُنہوں نے بچّے کی لاش کو سیوا کے کمرے میں پہنچا دیا اور سیوا نے کیشب کے پالتو کُتّے اور بچّے کی لاش پر تجربہ شروع کیا۔ اِس تجربے میں اُسے مُشکل پیش آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ایک طرف ایک بے جان لاش تھی اور دوسری طرف وہ کُتّا تھا جس کی جان بیسیوں بار ادل بدل چکی تھی۔ نہ جانے کتنی بار وہ کیشب بن چُکا تھا اور کتنی بار سیوا کے رُوپ میں آیا تھا۔

سیوا نے اپنا تجربہ شروع کیا تو ذرا سی دیر بعد ہی گیا بے جان ہو کر گِر پڑا اور لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اُس کے بعد جو کُچھ ہوا، وہ سیوا کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا

تھا۔ لڑکے نے زندہ ہوتے ہی اپنے اِرد گرد دیکھا، پھر اُٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا، باہر کی طرف نظر کی اور اِس سے پہلے کہ سیوا کُچھ کہتا یا کرتا، اُس نے آگے بڑھ کہ مُردہ کُتّے کی ٹانگ پکڑی اور اُسے اُٹھا کر باہر بھاگ گیا۔ سیوا نے لڑکے کا تعاقب کیا، مگر لڑکے کے جسم میں کُتّے کی روح آجانے کے ساتھ ہی اُس میں کُتّے کی سی تیزی بھی آگئی تھی۔ وہ کُتّے کو لے کر باہر نکلا اور پھر چھلاوے کی طرح کہیں غائب ہو گیا۔

سیوا کُچھ دیر تک تو لڑکے کی اس حرکت پر جی ہی جی میں جھنجھلاتا رہا، پھر اچانک اسے کُچھ خیال آیا۔ وہ ایک دم مکان کی طرف واپس ہوا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کمرے کی طرف بڑھا جہاں وہ کیشب کو چھوڑ کر گیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب اُس نے دِن کے وقت کیشب کو تنہا چھوڑا تھا، ورنہ اِس سے پہلے وہ ہر وقت کیشب کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی خود کُتّا بن کر اور کبھی کیشب کوئی کُتّا بنا کر۔

کیشب کے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اُس نے اندر نگاہ کی تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیشب کا کمرا خالی تھا۔ بالکل خالی!

سیوا نے سوچا کہ کیشب کسی اور کمرے میں چلا گیا ہے۔ اُس نے مکان کے سارے کمروں کا چکّر لگایا لیکن کیشب کسی بھی کمرے میں نہ تھا۔ وہ لڑکے کا تعاقب کرتے ہوئے باغ کا چکّر پہلے ہی لگا چُکا تھا۔ کیشب وہاں ہوتا تو اُسے ضرور دِکھائی دیتا۔

سیوا کو یوں لگا جیسے زمین اُس کے پیروں تلے سے نکلنے لگی ہے۔ اُسے اپنی ساری محنت پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ کیشب اپنے مکان سے نکل کر کہاں جا سکتا ہے۔ فوراً ہی اُس کا ذہن سارنگ بابا کی طرف گیا، جنھوں نے کیشب کو اپنا پرانا واقف اور دوست بتایا تھا، اور یہ خیال آتے ہی سیوا سرائے کی طرف چل دیا۔

سیوا سرائے کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا اور سیدھا اُس کمرے کی

طرف بڑھا جہاں سارنگ بابا ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن اچانک اُس کی نظروں سرائے کے صحن میں بوڑھے پیپل کے درخت کی طرف اُٹھ گئیں۔ سارنگ بابا اور بہت لوگوں کے ساتھ اُس پیڑ تلے کھڑے تھے۔ اُن میں کیش بھی تھا۔

لیکن یہ وہ کیشب نہیں تھا جو ایک چلتا پھرتا مُردہ بن کر رہ گیا تھا، جس کی رنگت ہلدی کی طرح زرد تھی اور جس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ یہ کیشب ایک بھلا چنگا اور جیتا جاگتا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ اُس وقت بوڑھوں کی طرح لاٹھی کا سہارا لیے ہوئے نہیں بلکہ جوانوں کی طرح سینہ تانے کھڑا تھا۔

سارنگ بابا نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے دوست کی ساری بیماری دور کر دی تھی۔ سارنگ بابا کے دوسری طرف وہ لڑکا کھڑا تھا جس کے جسم میں سیوا نے کیشب کے پالتو کُتّے کی جان ڈالی تھی۔ کُتّے کی لاش اُس کے قدموں میں پڑی تھی۔

سارنگ بابا کیشب اور لڑکے سے کوئی دس پندرہ قدم کے فاصلے پر وہ لڑکے کھڑے تھے جو باغ میں اُس لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

قُدرت نے ہمیں جو موقع دیا تھا، ہم نے اُس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ جب سیوا کیشب کو اکیلا چھوڑ کر اپنے کمرے میں تجربہ کر رہا تھا تو سارنگ بابا کے حکم سے میں کیشب کو اُس کے مکان سے لے آیا تھا۔ پھر میں نے اُس لڑکے کو بھی کُتّے کی لاش سمیت سرائے کے صحن میں پہنچا دیا تھا۔ یہی نہیں، میں اُن لڑکوں کو بھی لے آیا تھا جو اُس لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

کیشب اور اُس لڑکے پر نظر پڑتے ہی سیوا کو اندازہ ہو گیا کہ اُس کا سارا کھیل چوپٹ ہو گیا ہے۔ مگر وہ اِتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ اُس کی لال لال انگارا سی آنکھیں کُچھ اور سُرخ ہو گئیں اور وہ غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

”یہ آپ نے اچھّا نہیں کیا، سارنگ بابا! میں نے آپ کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیا لیکن آپ نے میرے معاملے میں دخل دے کر میرے غصّے کو للکارا ہے اور اِس کا نتیجہ اچھّا نہیں ہو گا۔ بہت بُرا ہو گا۔“

سارنگ بابا نے سیوا کے غصّے کا کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ مُسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

"ہم نے اچھّا کیا یا بُرا یہ ہم جانتے ہیں، لیکن تُم نے خود بھی کبھی سوچا کہ تُم کیا ہو اور کیا کرتے رہے ہو؟ تُم جوگی ہو۔ تمھیں قدرت نے ایک طاقت بخشی ہے۔ علم دیا ہے۔ تمھیں چاہیے تھا کہ اِس طاقت اور علم کے ذریعے لوگوں کا بھلا کرتے، دُکھی انسانوں کے کام آتے مگر تُم نے کیا کیا؟ تُم یہاں ایک مسکین سے نوکر کے روپ میں آئے اور میرے دوست کو اپنے جال میں اِس طرح جکڑ لیا کہ یہ بے چارہ جیتے جی مر گیا۔ یہ تمھاری مرضی کے خلاف اپنی زبان تک بھی نہیں ہلا سکتا تھا، کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ تُم اِس کے ساتھ کیسا ذلیل سلوک کر رہے ہو! تُم کبھی اِسے کُتّا بنا کہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور کبھی خود کُتّا بن کر اِس کے ساتھ چمٹے رہتے تھے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، بابا جی؟" سیوا نے حیرت سے کہا۔

"بننے کی کوشش نہ کرو سیوا!" سارنگ بابا بولے۔ "ہم جوگی ہیں اور جوگی کو جوگی کی پہچان ہوتی ہے۔ ہم نے تمھیں پہچان لیا تھا اور تمھارا کمال بھی جان لیا تھا۔"

پھر سارنگ بابا میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ”اِس انوشا بیٹے کو دیکھ رہے ہو؟ یہ یہیں تمہارے سامنے کھڑے کھڑے پورب سے پچھّم اور اُتر سے دکھّن تک کی خبر لا سکتا ہے۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹّی اس کا حکم مانتے ہیں۔ ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر تک کوئی راجا نہیں جس نے اِس کے آگے سر نہ جھکایا ہو۔ اِس انوشا نے تمہارا سارا کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح کبھی تُم کُتّا بن جاتے تھے اور کبھی کیشب کو کُتّا بنا دیتے تھے۔“

سیوا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سارنگ بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سارنگ بابا کہنے لگے!

”تُم اِس لڑکے کے جسم میں کُتّے کی جان ڈالنے کے بعد اپنی جان کُتّے کے جسم میں ڈالنا چاہتے تھے کہ یہ لڑکا کُتّے کو اُٹھا کر باہر بھاگ گیا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہارا کام ادھورا رہے، اس لیے ہمارے کہنے پر انوشا اس لڑکے کو کُتّے کی لاش سمیت یہاں لے آیا۔ ہم نے اِن لڑکوں کو بھی بُلوا لیا ہے جو باغ میں اِس لڑکے

کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہمارا دوست کیشب بھی یہاں موجود ہے، اور اگر تم چاہو تو تمہارے اِس کمال کو دیکھنے کو دس بیس سو پچاس بلکہ ہزار دو ہزار لوگ بھی بُلوائے جا سکتے ہیں۔ کہیں وستُو والے تمہارا یہ کمال دیکھ کر بُہت خوش ہوں گے؟"

"نہیں!" سیوا نے غصّے سے کہا۔ "میں اِس چال میں آنے والا نہیں۔"

سارنگ بابا نے نرمی سے کہا۔ "وہ تو تم آ بھی چُکے سیوا مہاراج۔ یہ نہ سمجھو کہ تُم اپنے آپ یہاں آئے ہو۔ جس طرح ہم اپنے دوست اور اِس لڑکے کو یہاں لائے ہیں اور جس طرح ہم نے اِس لڑکے کے ساتھیوں کو یہاں بُلوایا ہے، اِسی طرح تُم بھی یہاں لائے گئے ہو۔ اب سیدھے سبھاؤ اپنا ادھورا کام پورا کرو اور جلدی سے اپنی جان اِس کُتّے کے جسم میں لے جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو! کایا پلٹ کا کھیل ہم بھی جانتے ہیں اور تُم سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ تُم تو ہلدی کی ایک گرہ کے بل پر پنساری بن بیٹھے ہو، مگر ہم نے شیل شر نگن کی پہاڑی پر ناگیسن مہاراج

کے قدموں میں ایک عُمر گزاری ہے، اور اُن سے وہ کُچھ سیکھا ہے جس کی تمہیں ہوا بھی نہیں لگی۔"

سارنگ بابا نے ابھی بات ختم نہیں کی تھی کہ سیوا نے پلٹ کر باہر جانے کی کوشش کی، مگر کوشش کے باوجود وہ ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکا۔ سارنگ بابا کہنے لگے!

"تمہیں شاید ہماری بات کا یقین نہیں آیا ابھی تک جوگی تو کیا، عام آدمیوں میں بھی تُم سا ڈھیٹ ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ سُن لو اور جان لو! ہماری مرضی کے بغیر تُم چاہو بھی تو یہاں سے نہیں جا سکتے۔ اب جلدی سے اپنا وہ کھیل پورا کرو جسے دیکھنے کے لیے یہ لڑکے یہاں اکٹھّے ہوئے ہیں۔"

سیوا نے سمجھ لیا کہ وہ پُوری طرح سارنگ بابا کے بس میں ہے اور اُن کے آگے اُس کی ایک نہیں چلے گی۔ اُس نے اپنے اِرد گرد دیکھا۔ پھر مُنہ ہی میں کُچھ پڑھا اور جہاں کھڑا تھا، دھم سے وہیں زمین پر گر گیا۔

سیوا کے زمین پر گِرتے ہی لڑکے کے قدموں میں پڑا ہوا کُتّا زندہ ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے سر کو ایک جھٹکا دیا، آنکھیں کھولیں اور سیدھی کیشب کی طرف چھلانگ لگائی۔ اُس کا نشانہ کیشب کی گردن تھی۔

قریب تھا کہ وہ کیشب کی گردن اپنے مُنہ میں لے کر اُسے دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالتا کہ میں نے اپنی جگہ سے ایک چھلانگ لگائی اور اُسے گردن سے دبوچ لیا۔

"شاباش!" سارنگ بابا نے کہا۔ "اِسے قابو میں رکھو!"

پھر وہ اُس کُتّے سے بولے۔ "سیوا مہاراج! پہلے تو ہم چاہتے تھے کہ معاملہ سیدھی طرح ختم ہو جائے لیکن تُم نے کُتّے کی شکل میں آتے ہی ہمارے دوست پر وار کرنے کی جو کوشش کی ہے۔ اِس سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ تُم کُتّے کی وہ دُم ہو جو کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اب ہم تمہارا کُچھ اور بندوبست کریں گے۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے اپنے تھیلے سے چودہ ہاتھ لمبے اژدھے کی راکھ نکالی اور کُچھ

پڑھ کر وہ راکھ کُتّے کے مُنہ میں ڈال دی۔ پھر بولے۔ "جا! اب تیری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِسی کُتّے کے جسم میں رہے گی۔ تو در در بھٹکے گا اور ہر دروازے سے دُھتکار جائے گا۔"

اتنے میں ایک زور دار پھنکار کی آواز سُنائی دی۔ یہ شانی کی پھنکار تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ شانی میرے گلے سے اُتر کر سیوا کی لاش کے پاس پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک اور پھنکار کی آواز آئی اور سیوا کی لاش سوکھی لکڑی کی طرح دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

سیوا کی روح کُتّے کے جسم میں تھی اور یہ روح اپنے جسم کو اپنے ہی سامنے جلتے دیکھ رہی تھی۔ لاش کو جلتے دیکھ کر کُتّے کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ یہ چیخ کُتّے کی نہیں، سیوا کی چیخ تھی۔ اور تو اور لڑکوں نے بھی اِس چیخ کو پہچان لیا اور اِس چیخ کا جواب قہقہوں کی صُورت میں دیا۔ سیوا کی رُوح کا کُتّے کے جسم میں جانا، اِس طرح کُتّے کا زندہ ہو جانا اور پھر سانپ کی پھنکا سے لاش کا جل اُٹھنا، اُن کے لیے

ایک تماشے سے کم نہ تھا۔ ذرا دیر بعد ہی لاش جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

سارنگ بابا بھر کُتّے سے بولے۔ ”جا اور کسی کوڑے کے ڈھیر پر اپنے پیٹ بھرنے کا سامان تلاش کر۔ تُو وہ بد بخت ہے جس نے قُدرت کی دی ہوئی انمول طاقت کی قدر نہ کی اور اُسے بھلائی کے بجائے بُرائی کا ہتھیار بنا لیا۔ اب تو ہمیشہ کے لیے اِس روپ میں اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔“

سارنگ بابا کے اشارے پر میں نے کُتّے کو چھوڑ دیا اور وہ سر جھکائے، ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ، باہر کی طرف بڑھا۔ لڑکے روڑے اور پتھّر لے کر اُس کے پیچھے ہو لیے۔

اُن کے جانے کے بعد خاصی دیر خاموش رہی۔ پھر سارنگ بابا کیشب سے کہنے لگے۔ ”لو میرے دوست! تمھیں اِس بلا سے نجات مل گئی جس نے تمھیں جیتے جی مار دیا تھا۔ قدرت نے تمھارے حال پر بہت بڑی مہربانی کی ہے۔“ واقعی قُدرت نے یہ کیشب کے حال پر بُہت بڑی مہربانی کی تھی۔ اُس نے قُدرت کی اِس

مہربانی کا شُکریُوں ادا کیا کہ اُسی شام اپنی آدھی دولت کپل وستُو اور آس پاس کی
بستیوں کے محتاجوں، غریبوں اور فقیروں میں بانٹ دی۔

اِندرا اِبندرا کے شہر میں

کپل وستُو سے چل کر، بہت دِنوں بعد، جب ہم گنڈک کے گھنے جنگل سے گزرے تو ایک درخت کے نیچے کسی کو لیٹے پایا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ اِس گھنے جنگل میں یہ کون ہے جو درخت کے نیچے یوں مزے سے لیٹا ہُوا ہے۔ قریب جا کر دیکھا تو ہماری حیرانی اور بھی بڑھ گئی۔ یہ کوئی عورت تھی جس نے مردانہ لباس پہنا ہوا تھا، اور وہ لیٹی ہوئی نہیں تھی، اُسے کسی سانپ نے ڈس لیا تھا، اور سر سے پاؤں تک اُس کا سارا جسم نیلا پڑ چُکا تھا۔ قریب ہی ایک درخت سے ایک گھوڑا

بند ھا تھا۔

سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر اُسے غور سے دیکھا۔ عورت کی پنڈلی پر زخم تھا۔ زخم کو اپنی طرح دیکھنے کے بعد سارنگ بابا بولے۔ ”اوہو! اِسے جس سانپ نے کاٹا ہے، وہ تو کوئی امبر ہی کا بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔“

پھر وہ اُوشا سے کہنے لگے۔ ”اوشا بیٹی، تمہیں یاد ہو گا کہ امبر نے سکندر کی بیوی رُخسانہ کے جسم سے زہر چُوسا تھا۔ یہ عورت بھی شاید کِسی سکندر کی بیوی ہو۔ اپنے امبر سے کہو کہ ایک بار پھر ذرا تکلیف کرے۔“

”جیسے آپ کا حکم بابا جی۔“ اُوشا بولی۔ پھر وہ امبر کو لے کر آگے بڑھی، اُس کا مُنہ عورت کی پنڈلی کے زخم پر لگایا اور آہستہ سے کہنے لگی۔ ”امبر! اِس عورت کے جسم سے سارا زہر نکال لو۔“

اس کے ساتھ ہی سارنگ بابا نے مُجھے اشارہ کیا اور میں بین پر مہا تالی کی دُھن

بجانے لگا۔ مہاتالی نے وہی اثر دِکھایا جو ہم اِس سے پہلے سکندر کی بیوی کے سِلسلے میں دیکھ چُکے تھے۔ اُس کے اثر سے سانپ کا زہر اُس عورت کے جسم سے کھنچ کھنچ کر امبر کے جسم میں پہنچنے لگا۔ جیسے جیسے اس عورت کے جسم سے زہر نکلتا گیا، اُس کی نیلاہٹ کم ہوتی گئی اور کُچھ دیر بعد بالکل ختم ہو گئی۔

امبر عورت کے جسم سے سارا زہر چُوس چُکا تو سانگ نے اُوشا کو اشارہ کیا۔ اُوشا نے امبر کو عورت کی پنڈلی سے ہٹالیا اور میں نے بین ہونٹوں سے ہٹالی۔

اِس کے بعد سارنگ بابا پھر اُس عورت کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے تھیلے سے وہی دوا نکالی جو اس دوست سانپ سے تیّار ہوئی تھی جِسے ہم نے سارنگ بابا کے سردار کی بیوی کے جسم سے نکالا تھا۔ یہی دوا سارنگ بابا نے ٹیکسلا کے جشن میں مُجھ سے مُقابلہ کرنے والے بُوڑھے سپیرے اور اُس کے ساتھیوں کے چھالوں پر لگائی تھی۔ اِسی دوا کو اُنہوں نے رُخسانہ کی پنڈلی کے زخم پر لگایا تھا اور اب یہی دوا اُنہوں نے اُس عورت کی پنڈلی پر اُس جگہ اچھّی طرح لگا دی جہاں

سانپ کے کاٹے کے زخم کا نشان تھا۔

خاصی دیر بعد اُس عورت کے جسم میں حرکت ہوئی اور اُس کے جسم میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ کُچھ دیر اور اِسی طرح گُزری اور پھر وہ عورت اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے، چاروں طرف یُوں دیکھ رہی تھی جیسے ابھی ابھی کسی ڈراؤنے خواب سے جاگی ہو۔ پھر وہ سِسکیاں بھرنے لگی اور موٹے موٹے آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گِرنے لگے۔

سارنگ بابا نے محبّت اور شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے۔

"ڈرو نہیں، بیٹی۔ اپنے پیدا کرنے والے کا شُکر کرو۔ تمہیں تو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اور تمہارا تمام بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ تمہاری قسمت اچھّی تھی کہ ہم اِدھر آ نکلے۔ ہم نے اُوشا بیٹی کے امبر کی مدد سے تمہارے جسم کا سارا زہر نکال دیا ہے۔ اب تُم بالکل ٹھیک ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ، تُم اِس گھنے اور خطرناک جنگل میں اکیلی کیا کر رہی تھیں؟ تُم نے مردانہ بھیس کاہے کو بھر رکھا ہے؟"

اِس پر اُس عورت نے اپنی کہانی سُنائی۔ اُس کا رُوپ وتی تھا اور وہ دھولا گری کے راجا ہر نام کی بیٹی تھی۔ اُس کی شادی مکتی ناتھ کے راجا شبدیال کے بڑے بیٹے راج مار کیسر کے ساتھ ہوئی تھی۔

راج کمار کیسر کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اِس شوق میں روپ وتی بھی اُس سے پیچھے نہیں تھی۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ دونوں شکار کے لیے نِکل جاتے اور کئی کئی ہفتوں اور بعض دفعہ کئی کئی مہینوں کے بعد محل میں واپس آتے تھے۔ شکار کی اِن مہموں میں راج کمار کیسر روپ وتی کو مردانہ لباس پہنا کر ساتھ رکھتا تھا۔

شکار کی ایسی ہی ایک مُہم پر وہ گنڈک کے گھنے جنگل میں آ نکلے تھے۔ اُس جنگل میں شکار کھیلتے اُنہیں رات ہو گئی۔ اتنا وقت نہ تھا کہ وہ آسانی کے ساتھ کسی قریبی آبادی میں پہنچ سکتے۔ اِس لیے اُنہوں نے رات اُسی جنگل میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اِس جنگل میں درندے، سانپ بچھّو اور دوسرے مُوذی جانور کثرت سے ہیں، اِس لیے اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ آدھی رات تک رُوپ وتی

سوئے اور کیسر جاگ کر پہرا دے۔ پھر آدھی رات کے بعد کیسر آرام کرے اور روپ وتی جاگ کر پہرا دے۔

اِس فیصلے کے مطابق روپ وتی سو گئی اور کیسر پہرا دینے لگا۔ اِس کے بعد کیا ہوا، رُوپ وتی کو اُس کا کُچھ پتا نہیں۔ کیسر اُس کے پاس سے کہاں گیا، کیسے گیا اور کیوں گیا؟ یہ بھی وہ نہیں بتا سکتی تھی۔ اُس نے تو آنکھیں پر اپنے سامنے اپنے شوہر کے بجائے سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا کو دیکھا تھا۔

اُس کی داستان سُن کر سارنگ بابا بولے۔ ”میں ساری بات سمجھ گیا ہوں، بیٹی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تُم سوئیں تو تمھیں سانپ نے ڈس لیا، تمھارے شوہر نے یا تو تمھیں بے آرام کرنے کے بجائے خود ہی ساری رات پہرا دینے کا فیصلہ کیا، یا پھر یہ ہوا کہ تُم اُس کے جگانے پر بھی نہیں جاگیں اور وہ صبح تک پہرا دیتا رہا۔ صُبح کے اُجالے میں اُس نے تمھیں دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ تمھیں سانپ نے ڈس لیا ہے کیوں کہ تمھارا تمام جسم سر سے پاؤں تک نیلا پڑ گیا تھا۔ اِس لیے وہ تمھیں

مُردہ خیال کر کے شہر کی طرف چلا گیا ہو گا۔ تاکہ وہاں سے تمہاری آخری رسموں کے لیے ضروری سامان خرید کر لا سکے۔"

سارنگ بابا کی یہ بات سُن کر روپ وتی نے کہا۔ "شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ لیکن ایسا ہی ہُوا ہے تو اب تک تو اُنہیں واپس آ جانا چاہیے تھا۔ شہر یہاں سے زیادہ دُور نہیں اور اُن کا گھوڑا بھی کوئی معمولی گھوڑا نہیں، ہَوا سے باتیں کرتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اُسے سامان خریدنے میں دیر لگ گئی ہو۔" سارنگ بابا بولے۔ "گھبراؤ نہیں۔ ہم کُچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔ اگر پھر بھی تمہارا شوہر نہ آیا تو میں انوشا بیٹے کو بھیج دوں گا اُس کا پتا کرنے کے لیے۔ اور تمہارا شوہر پاتال میں بھی ہوا تو انوشا اُسے وہاں سے بھی ڈھونڈ لے گا۔ اطمینان رکھو۔"

سارنگ بابا کے کہنے سے روپ وتی کو کُچھ حوصلہ تو ہوا مگر جیسے جیسے دِن گُزرتا جا رہا تھا، اُس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر جب شام ہونے کو آئی تو اُس کی آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

”بابا جی، اب تو شام ہو چُکی ہے۔ ابھی تک وہ واپس نہیں آئے!“ یہ سُن کر سارنگ بابا نے مُجھ سے کہا۔ ”انوشا بیٹے، جا کر ذرا دیکھو تو سہی، ہمارے راج کمار کیسر کہاں ہیں؟“

روپ وتی نے کہا۔ ”میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ مُجھے یقین ہے کہ وہ کسی مُصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“

”یہ بات ہے تو ہم سبھی چلتے ہیں۔“ سارنگ بابا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ہم چاروں شہر کی طرف چل دیے۔ روپ وتی نے اپنا گھوڑا بھی ساتھ لے لیا۔ شہر کے بڑے دروازے کے قریب پہنچے تو وہاں ہمیں چار لکڑ ہارے ملے جِن کے پاس ہی لکڑیوں کے گٹھّے پڑے تھے۔ روپ وتی کا مردانہ لباس چونکہ ایک راج کُمار کا سا تھا، اِس لیے اُسے دیکھتے ہی وہ پُکارے!

”راج کُمار جی، ذرا سی دیر کے لیے کہہ کر گئے تھے اور اب شام کے قریب آ کے

شکل دِکھائی ہے۔ سنبھالو اپنی لکڑیاں اور پیسے دو ہمیں کہ ہم آٹا دال لے کر گھر جائیں۔"

ہم سمجھ گئے کہ راج کمار کیسر نے روپ وتی کی چِتا کے لیے اِن لکڑہاروں سے لکڑیوں کا سودا کیا ہو گا اور اُن سے اِنتظار کرنے کے لیے کہہ کر شہر چلا گیا ہو گا۔ روپ وتی نے بھی یہ بات سمجھ لی۔ وہ کہنے لگی! "بھائیوں، تمہیں جو تکلیف ہوئی، اُس کی معافی چاہتا ہوں۔ میں شہر میں ایک اور کام میں اُلجھ گیا تھا۔ اِس لیے دیر ہو گئی۔ ویسے بھی اب مُجھے اِن لکڑیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تُم اُنہیں اپنے پاس ہی رکھو۔"

یہ کہتے ہوئے روپ وتی نے ایک ایک سونے کا سِکّہ اُن چاروں لکڑہاروں کو دیا۔ سونے کا سِکّہ پا کر وہ اپنی ساری تکلیف بھول گئے اور لکڑیاں اُٹھا کر چل دیے۔

ہم شہر میں داخل ہو کر کُچھ دُور ہی گئے تھے کہ روپ وتی کو راج کمار سمجھتے ہوئے ایک بزاز نے آواز دی:

”راج کمار جی، یہ اپنا لٹھّے کا تھان تو لیتے جاؤ۔ تُم تو کہہ گئے تھے کہ خُوشبوؤں کی دُکان سے عطر پھلیل لے کر ابھی آتا ہوں، کہیں وہاں اِندرا بِندرا کے جال میں تو نہیں پھنس گئے تھے؟“

ہم سمجھ گئے کہ راج کمار کیسر نے اُس دُکان دار روپ وتی کے کفن کے لیے لٹھّے کا تھان خریدا تھا۔ اور پھر تھان اُس دکان پر چھوڑ کر عِطر پھلیل لینے اِندرا بِندرا کی دُکان سے چلا گیا تھا۔ رُوپ وتی نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا! ”بھائی، تمہیں جو تکلیف ہوئی، اُس کی معافی چاہتا ہوں۔ میں اصل میں ایک اور کام میں اُلجھ گیا تھا۔ ویسے بھی اب مُجھے اِس تھان کی ضرورت نہیں رہی۔ تُم اِسے اپنے پاس ہی رکھو۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے سونے کے دو سِکّے جیب سے نکالے اور دُکان دار کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اُس تکلیف کے بدلے میں ہیں جو تمہیں اُٹھانی پڑی۔“

اِس کے بعد ہم آگے بڑھ گئے۔ خوشبوؤں کی دُکان کے بارے میں کِسی سے کُچھ

پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ خُوشبو اپنا پتا خود ہی دے دیتی ہے، یہ دُکان ابھی دُور ہی تھی کہ یکایک روپ وتی نے کہا۔ ”وہ۔۔۔ وہ دیکھئے! وہ اُن کا گھوڑا دُکان کے باہر بندھا ہوا ہے۔ وہ وہیں گئے ہوں گے۔“

سارنگ بابا نے ایک دُکان دار سے پوچھا۔ ”کیوں بھئی! وہ دُکان کِس کی ہے جِس کے باہر گھوڑا بندھا ہوا ہے؟“

دُکان دار نے پہلے ہماری طرف دیکھا اور پھر اُس دُکان کی طرف۔ پھر وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس شہر میں پہلی بار آئے ہو شاید۔ بچ کے رہنا میاں۔ وہ دُکان جِس کا تُم پتا پُوچھ رہے ہو، اِندرا اِندرا دو بہنوں کی ہے۔ کہنے کو تو عِطر پھلیل بیچتی ہیں مگر کمال کی جادُوگرنیاں ہیں۔ پہلے پہلے جوانوں کو مکھّی بنا کر دیوار سے چِپکا دیتی ہیں، چڑیا بنا کر پنجرے میں ڈال لیتی ہیں۔۔۔ بچ کے رہنا ہاں۔“

یہ کہہ کر دُکان دار نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ ہم آگے بڑھ گئے اور پھر اِندرا اِندرا کی دُکان کے سامنے جا کر رُک گئے۔ روپ وتی کا گھوڑا دُکان کے

سامنے بندھے ہوئے گھوڑے کو پہچان کر زور سے ہنہنایا تو اُس کی آواز سُن دکان کے اندر لٹکے ہوئے پنجرے میں بند کبوتر اُچھل اُچھل کر، کرنے لگا۔

کبُوتر کے پر پھڑ پھڑانے اور غُٹر غُوں غُٹر غُوں کرنے سے ہم سمجھ گئے کہ راج کمار کیسر اِس وقت اُس پنجرے کے اندر کبوتر کے روپ میں ہے۔ روپ وتی بھی سمجھ گئی۔ مگر ہم جان بوجھ کر انجان بن گئے اور گھوڑوں کے ہنہنانے اور کبوتر کی غُٹر غُوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اِندرا اِبندرا کی طرف متوجّہ ہوئے۔

دونوں بہنیں گوری چِٹّی رنگت اور خوب صورت ناک نقشے کی تھیں۔ ذہانت اور شرارت دونوں کے چہروں سے صاف ظاہر ہوتی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ایک ساتھ پُکاریں!

”آیئے آیئے، مہاراج۔ کون سا عِطر چاہیے آپ کو؟ گُلاب، چنبیلی، خس، مہندی، دِل پسند، رات کی رانی۔ ہر عِطر، ہر خُوشبو موجود ہے۔“

روپ وتی نے اُن کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ ”کیا کوئی ایسا عِطر ہے تمہارے پاس جو رُوٹھوں کو منا دے بچھڑوں کو ملا دے؟“

”اہاہاہا!“ دونوں بہنیں ایک ساتھ چہکیں۔ ”اے راج کُمار! تُم تو اچھّے خاصے شاعر معلوم ہوتے ہو۔ آہاہاہا! کیا خُوب صورت اور من موہنا شعر کہا ہے۔“

”میں نے شعر نہیں کہا۔“ روپ وتی بگڑ کر بولی۔ ”یہ بتاؤ، کوئی ایسا عِطر ہے تمہارے پاس؟“

”ہے تو نہیں۔“ اِندرا بولی۔ ”پر تیّار ہو سکتا ہے۔ کیوں بہن بِندرا؟“

”ہاں بہن اِندرا۔“ بِندرا نے جواب دیا۔

”تو تیّار کر دو۔“ رُوپ وتی نے کہا۔ ”ہم مُنہ مانگی قیمت دیں گے۔“

”ابھی؟“ اِندرا نے حیرانی سے کہا۔ ”عطر ہے، شربت کا گلاس نہیں کہ جھٹ سے بنا کر گاہک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کم سے کم دس دِن لگیں گے تیّار کرنے میں۔“

”دس دِن!“ رُوپ وتی نے حیرانی سے کہا۔ اور پھر سارنگ بابا سے بولی۔ ”اب کیا کریں؟ یہ اِندرا بِندرا تو دس دِن کی بات کرتی ہیں اور ہمارے لیے ایک ایک پَل ایک ایک سال کے برابر ہے۔“

”غُٹر غُوں! غُٹر غُوں!“ کبوتر نے ہمیں پھر اپنی طرف متوجّہ کیا۔

رُوپ وتی نے اُوپر دیکھا اور پھر مُسکرا کر پنجرا اُتار لیا۔ وہ کبوتر کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بڑا پیارا کبوتر ہے۔ کہاں سے ملا تمہیں؟ ہمارے ہاتھ بیچ دو تو مُنہ مانگے دام ملیں گے۔“

اِندرا بِندرا دونوں کا رنگ اُڑ گیا مگر اُنھوں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بِندرا کہنے لگی۔ ”نہیں مہاراج! یہ کبوتر بکاؤ نہیں ہے۔ کوئی ہمارے سامنے سونے کے سِکّوں کا ڈھیر بھی لگا دے تو بھی ہم یہ کبوتر اُسے نہ دیں؟“

”ایسی کیا بات ہے اِس کبوتر میں؟“

”یہ کِسی کی نِشانی ہے۔“

”اوہو!“ رُوپ وتی نے افسوس سے کہا۔ ”پھر تو ہم یہ کبوتر بالکل نہ لیں گے۔ لیکن اجازت ہو تو ذرا اِسے ہاتھ میں لے کر ہی دیکھ لیں۔“

”اجازت ہے۔“ اِندرا نے جواب دیا۔

روپ وتی نے پنجرا کھول کر کبوتر ہاتھ میں تھام لیا اور اُس کے پیروں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ”غُٹر غُوں! غُٹر غُوں!“ کبوتر نے جیسے اپنی آواز سے رُوپ وتی کی حرکت کا جواب دیا۔ سارنگ بابا نے ہاتھ بڑھا کر کبوتر رُوپ دتی سے لے لیا اور اُسے ذرا غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”سچ مُچ بڑا پیارا کبوتر ہے! بڑا ہی پیار!“

اِس کے ساتھ ہی وہ کبوتر کے پروں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ وہ اصل میں اُس کے پروں کو ٹٹول رہے تھے۔ جلد ہی اُنہیں معلوم ہو گیا کہ کبوتر کے پروں کے نیچے ایک دھاگا بندھا ہوا ہے۔ یہ جادُو کا دھاگا تھا۔ اُنھوں نے کھٹ سے دھاگا کھینچ کر

توڑ دیا۔ دوسرے ہی لمحے کبوتر غائب ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ راج کُمار کیسر اُن کے سامنے کھڑا تھا۔

اِندرا اِبندرا نے یہ دیکھا تو اُن کی چیخ نکل گئی اور وہ دُکان کے پچھلے حصّے کی طرف بھاگیں، جہاں اُن کا جادُو ٹُونے کا سامان رکھا تھا۔ مگر میں نے تیزی سے اُن کی طرف پھونک ماری اور آگ کے حلقے نے اُنہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

راج کمار کیسر حیرانی سے رُوپ وتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”تُم! تُم زندہ ہو، رُوپ وتی؟“

”ہاں!“ روپ وتی نے جواب دیا۔ ”یہ سب سارنگ بابا انوشا اور اُوشا بہن کی مہربانی ہے۔“ ”ہاں!“ راج کمار کیسر بولا۔ ”اور یہ بھی اِنہی کی مہربانی ہے کہ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں ورنہ اِن جادُوگرنیوں نے تو مُجھے کبوتر بنا ہی ڈالا تھا۔“

سارنگ بابا اِندرا اِبندرا سے کہنے لگے۔

”اے کم بختو! تُم جو عِطر پھلیل کے نام پر اپنے مکر فریب اور جادُو کی دُکان سجا کر بیٹھی ہو، اِس قابل نہیں ہو کہ تُم پر رحم کیا جائے اور تمہیں زندہ چھوڑا جائے۔“

اتنا کہہ کر سارنگ بابا نے شانی کو آواز دی۔ شانی تو پہلے ہی اُن کے اِشارے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میرے گلے سے اُترا اور پھنکاریں مارتا ہوا ساری دُکان میں پھِر گیا۔ دوسرے ہی لمحے دُکان میں آگ بھڑک اُٹھی۔ اِندرا اِبندرا چیخیں مارنے لگیں، لیکن آگ کے حلقے سے نکلنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ ہم اُچھل کر باہر آ گئے۔

ذرا سی دیر میں ہی اِندرا اِبندرا اپنے مکر و فریب کی دُکان سمیت جل کر راکھ ہو گئیں۔ آگ کا تماشا دیکھنے سارا بازار جمع ہو گیا تھا، لیکن اِس آگ میں جل کر راکھ ہو جانے والی اِندرا اِبندرا کے لیے ہمدردی کے دو بول بھی کسی کی زبان پر نہ تھے۔

شیش ناگ کا قرض

ہم راج کمار کیسر اور رانی روپ وتی کے ساتھ مکتی ناتھ پہنچے۔ راج کُمار کے باپ راجا شبدیال نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی اور جب اُسے سارا ماجرا معلوم ہوا تو وہ ہمارے قدموں میں بِچھ گیا۔ رُوپ وتی کے باپ راجا ہرنام کو خبر ہوئی تو وہ بھی دھولا گری سے بھاگا بھاگا مکتی ناتھ آیا اور اپنی بیٹی کے سہاگ کو بچانے پر ہمارے پاؤں دھو دھو کر پینے لگا۔

یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ٹیکسلا سے لے کر پاٹلی پُتر تک کتنے ہی

راجاؤں نے سارنگ بابا اور انوشا کے پاؤوں کو ہاتھ لگائے تھے۔ نئی بات تو یہ تھی کہ مکتی ناتھ کا راجا شبدیال آدھی رات کے وقت ہمارے پاس آیا اور اپنی مُشکل بیان کی۔

راجا ہرنام اپنی چھوٹی بیٹی اور اور روپ وتی کی بہن چندرا کی شادی شبدیال کے چھوٹے بیٹے اور راج کُمار کیسر کے بھائی کیلاش سے کرنا چاہتا تھا۔ راجا شبدیال کو یہ رشتہ ہر طرح سے منظور تھا، مگر نہ جانے کیوں کیلاش مان کر نہیں دے رہا تھا۔ اب راجا شبدیال یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ ہم کیلاش سے بات کر کے اُسے اِس رشتے کو قبول کرنے پر راضی کر لیں۔ سارنگ بابا نے کیلاش سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

اور جب راجا شبدیال ہمارے پاس سے رُخصت ہوا تو کیلاش ایک دم یوں ہمارے سامنے آ گیا جیسے چھت سے ٹپک پڑا ہو، یا اچانک زمین سے اُگ آیا ہو۔ شاید وہ کسی اندھیرے کونے میں چھُپ کر وہ تمام باتیں سُنتا رہا تھا جو ہمارے اور راجا

شبدیال کے درمیان ہوئی تھیں۔ اُس نے جھیپتے ہوئے سارنگ بابا کو سلام کیا تو سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے!

''کیلاش بیٹے، اچھّا ہوا جو تُم خود ہی آ گئے۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تُم وہ تمام بات چیت سُنتے رہے ہو جو ہمارے اور راجا شبدیال کے درمیان ہوئی ہے۔ کیا تُم سارنگ بابا کو بتاؤ گے کہ تُم چندرا کے ساتھ شادی کرنے سے اِنکار کیوں کر رہے ہو؟''

''میں مجبور ہوں بابا جی۔'' کیلاش نے جواب دیا۔ ''ہم تمہاری مجبوری جاننا چاہتے ہیں، بیٹا۔'' سارنگ بابا نے کہا۔ ''اپنے سارنگ بابا پر بھروسا رکھو اور دِل کی بات کہہ ڈالو۔ ہو سکتا ہے ہم اِس مُشکل کا کوئی حل تلاش کر لیں جس نے تمہیں اور تمہارے باپ کو پریشان کر رکھا ہے۔''

اِس پر کیلاش نے ہمیں اپنی داستان سُنائی۔ کہنے لگا۔ ''کئی سال پہلے کی بات تھی۔ شکار کی دُھن میں، مَیں مکتی ناتھ سے بہت دُور شمال کی طرف، کانگ مار کے

پہاڑی جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا۔ وہاں ایک ناگ نے مُجھے ڈس لیا۔ سپیروں کی ایک لڑکی نے میری جان بچائی۔ میں نے اُس لڑکی سے شادی کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اُس لڑکی نے کہا کہ اگر تُم نے اپنے وعدے کی لاج نہ رکھی تو یاد رکھو، میں تمہیں ناگن بن کر ڈس لُوں گی۔"

کیلاش کی یہ کہانی خاصی حیران کرنے والی تھی۔ مگر سارنگ بابا نے اُسے سُن کر حیرانی بالکل ظاہر نہیں کی، بلکہ مُسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "تُم نے اُس لڑکی کا نام نہیں بتایا؟"

"اُس کا نام۔۔۔ اُس کا نام چندرا ہے۔" کیلاش نے جواب دیا۔

"چندرا!" سارنگ بابا نے حیرانی سے کہا۔ "یہ تو رُوپ وتی کی اُسی بہن کا نام ہے جس کے ساتھ شادی سے تُم انکار کر رہے ہو۔"

"وہ راج کُماری چندرا ہے۔" کیلاش نے کہا۔ "اور یہ چندرا سپیرن ہے۔ کا نگ مار

کی سپیرن۔"

"اُس کے بعد تُم کبھی اُس سے ملے ہو؟" سارنگ بابا نے پوچھا۔

"جی ہاں، واسُکی راجا کے مندر میں۔" کیلاش نے جواب دیا۔ "ناگ پنچمی کے موقع پر کئی اور لڑکیوں کی طرح وہ بھی ناگ دیوتا کے سامنے ناچنے آتی ہے۔ وہ جب بھی ملتی ہے اپنا وعدہ یاد دلاتی ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں نے کسی دِن اپنا وعدہ توڑنے کے بارے میں سوچ بھی لیا تو وہ دِن میری زندگی کا آخری دِن ہو گا۔"

سارنگ بابا کیلاش کی یہ بات سُن کر کُچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے۔ "کیلاش بیٹے، تُم واقعی مُشکل میں ہو۔ تمہاری اُلجھن اِس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اب تک تُم ہر معاملے میں پوری طرح اپنے باپ کے فرماں بردار رہے ہو۔ خیر، ہم سوچیں گے کہ تمہارے لیے کیا کُچھ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس سے پہلے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک نظر تمہاری اُس سپیرن کو دیکھ لیں۔ کیا تُم اِس کا بندوبست کر سکتے

ہو؟“

”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ناگ پنچمی کا تہوار قریب ہی ہے۔ جب وہ یہاں آئے گی تو میں اُسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”بس ٹھیک ہے۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”اب تُم جاؤ۔“

کیلاش کے جانے کے بعد ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ سارنگ بابا پھر کسی سوچ میں کھو گئے تھے۔ اگلے دِن ہم واسُکی راجا کے مندر کی طرف چل دیے۔ یہ مندر شہر مکتی ناتھ سے کوئی ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا اور شیش ناگ اور تکشک ناگ کے تیسرے بھائی وَاسُکی راجا کے نام پر بنایا گیا تھا۔

جب ہم مندر میں داخل ہوئے تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یوں لگا جیسے میں پُشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر میں ہوں، جہاں میں نے اپنی زندگی کے پہلے دس سال شیش ناگ کے سائے میں گزارے تھے۔

اِس مندر کے باہر اور اندر کا سارا نقشہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا میں نے اپنے بچپن میں شیش ناگ کے مندر کا دیکھا تھا۔ فرق اگر کُچھ تھا تو صرف ناگ دیوتا کی مورتیوں میں تھا۔پُشکلاوتی کے مندر میں شیش ناگ کی مورتی تھی اور یہاں واسُکی راجا کی مورتی۔ ویسے شیش ناگ کی مُورتی کی طرح واسُکی راجا کی مورتی بھی سونے کی تھی۔

میں اِس مندر کو بڑی حیرانی سے دیکھتا رہا۔ آنسو میری آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اُوشا نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تُم رو کیوں رہے ہو؟"

"یہ بالکل ویسا ہی مندر ہے۔" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "بالکل ہمارے پُشکلاوتی والے شیش ناگ کے مندر جیسا۔ سکندر کے ہاتھوں برباد ہونے سے پہلے وہ مندر بھی ایسا ہی تھا۔ بالکل ایسا ہی۔"

”اچھّا!“ اُوشا نے کہا۔ ”پھر تو میں بھی ناچوں گی یہاں۔ شیش ناگ کا یہ قرض ابھی تک میرے ذمّے ہے۔ یاد ہے، جب تُم سُرخ ہیرے بھینٹ کرنے کے لیے پشکلاوتی گئے تھے۔ میں نے پہلے سے یہ منّت مان رکھی تھی کہ شیش ناگ کے سامنے اپنا ناچ پیش کروں گی، مگر مندر کی تباہی اور بربادی نے میرے دِل پر خوف طاری کر دیا۔ اب میں یہاں ناچوں گی۔ شاید ایک بھائی کے سامنے ناچ کا نذرانہ پیش کرنے سے دوسرے بھائی کا قرض میرے سر سے اُتر جائے۔“

اور اِس سے پہلے کہ میں کُچھ کہتا، سارنگ بابا بولے۔ ”تمہیں اپنا قرض اُتارنے کا موقع ضرور ملے گا، اُوشا بیٹی۔“ مگر اب نہیں، ناگ پنچمی کے موقع پر۔“

آخر ناگ پنچمی کا دِن آ پہنچا۔ واسُکی راجا کے مندر اور اُس کے سامنے میدان میں دُودھ کی کٹوریاں ہی کٹوریاں نظر آتی تھیں اور یوں لگتی تھیں جیسے کسی جھیل کی سطح پر کنول کے سفید پھول۔ لوگ آتے اور مندر میں تہوار کی رسمیں ادا کرنے کے بعد کٹوریوں میں دُودھ ڈال دیتے۔ اِدھر اُدھر سے سانپ آ کر اُن کٹوریوں

سے دُودھ پی رہے تھے۔

”میرے لیے یہ نظّارہ کوئی نیا نہیں تھا۔ میری زندگی کے پہلے دس سال پشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر میں ایسے ہی نظّاروں کے درمیان بیتے تھے۔

مگر یہاں، واسُکی راجا کے مندر میں، اُوشا کو اپنا پُرانا قرض چُکانا تھا۔ وہ مندر میں داخل ہوئی تو پُوجا کرنے والے پُوجا بھُول گئے اور کٹوریوں میں دُودھ ڈالنے والوں کو کٹوریوں میں دُودھ ڈالنا یاد نہ رہا، مگر اُوشا اپنے دھیان سیدھی مندر کے اندر واسُکی راجا کی مُورتی کے سامنے پہنچی اور رواج کے مطابق ساری رسمیں ادا کیں اور اِس کے ساتھ ہی اُس کے پیر حرکت میں آ گئے، مگر ذرا دیر بعد ہی اُس نے رُک کر میری طرف دیکھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اُوشا نے آواز دی:

”انوشا، وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ یہاں آ کر بِین بجاؤ!“

میں اُوشا کے پاس آیا اور اُس کا اشارا پاتے ہی بِین پر مہا تالی کی دُھن چھیڑ دی۔ مہا تالی کی دُھن اب بھی وہی تھی لیکن اُوشا کا ناچ وہی ناچ نہ تھا۔ راجا پورس کے دربار میں، چندر گُپت کے سامنے اور پاٹلی پُتر کے محل میں اُسی نے اپنے فن کا جادُو جگایا تھا۔ لیکن یہاں وہ ناگ دیوتا کے سامنے عقیدت کا اظہار کر رہی تھی۔ اپنی وہ منّت پوری کر رہی تھی جِس کا قرض بڑی دیر سے اُس کے ذمّے تھا۔

مگر عقیدت کے اِس اظہار کے باوجود اُوشا پھر اُوشا تھی۔ اُس سے اُس کا جادُو کون چھین سکتا تھا۔ اِس سے پہلے جو لڑکیاں ناچ چُکی تھیں، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُوشا کو بجلی کی طرح حرکت کرتے دیکھ رہی تھیں۔ اُن میں سے بعض نے حوصلہ کر کے اُوشا کے ساتھ ناچ میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی اُنہیں معلوم ہو گیا کہ اُس کا ساتھ دینا اُن کے بس کی بات نہیں۔

شام ہونے میں کوئی ایک پہر باقی تھا۔ نہ میری بِین کی دُھن میں کوئی فرق آیا تھا اور نہ اُوشا کے ناچ کی تیزی میں کوئی کمی آئی تھی کہ اچانک واسُکی راجا کی خوفناک

مُورتی کے پاس سے ایک رُعب دار آواز سُنائی دی!

”اُوشا! بس کرو؛ تمہارا قرض ادا ہو چکا ہے۔“

میں نے اور اُوشا نے ایک ساتھ، چونک کر واسُکی راجا کی مُورتی کی طرف دیکھا۔ مندر کے پروہت اور دوسرے لوگوں کی نگاہیں بھی اُس طرف اُٹھ گئیں۔ واسُکی راجا کی مُورتی کے چہرے کے بالکل برابر ایک چہرہ نظر آرہا تھا۔ یہ اُس شخص کا چہرہ تھا جو کبھی پشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر کا پروہت ہوا کرتا تھا۔ یہ اُس شخص کا چہرہ تھا جو میرا اماموں تھا۔ جِس نے میرے نانا کے مرنے کے بعد کنٹک قبیلے کی سرداری بھی سنبھالی تھی۔ یہ اُس شخص کا چہرہ تھا جِس نے اُوشا کو پیدا ہوتے ہی دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ اُس شخص کا چہرہ تھا جسے ایک نظر دیکھنے اور اُس کے پاؤں چھونے کی آرزو دِل میں لیے اُوشا پشکلاوتی گئی تھی، لیکن سکندر نے اُس کی آرزو کا شیشہ چکنا چور کر دیا تھا۔

یہ چہرہ ذرا سی دیر کو واسُکی راجا کی مُورتی کے برابر دِکھائی دیا اور پھر غائب ہو گیا۔

اُوشا یوں دیکھ رہی تھی جیسے کسی خواب سے جاگی ہو۔ پھر اُس نے اپنے اِرد گرد دیکھا، جھک کر مندر کے پروہت کو سلام کیا۔ اِس کے بعد ہم باہر کی طرف بڑھے اور مندر کی بیرونی دیوار کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ بظاہر اُوشا اپنے سامنے دُودھ پیتے ہوئے ناگوں کو دیکھ رہی تھی، مگر اُس کی نظریں کھوئی کھوئی سی تھیں جیسے وہ اپنے سامنے کُچھ بھی نہیں دیکھ رہی۔ شاید وہ کُچھ سوچ رہی تھی۔ خاصی دیر کے بعد وہ بولی! "انوشا! وہ کِس کی آواز تھی جو ہمیں سُنائی دی تھی؟ وہ کون شخص تھا جس کا چہرہ ہمیں مُورتی کے پاس دکھائی دیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "وہ اُس شخص کا چہرہ تھا جو کبھی پشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر کا پروہت ہوا کرتا تھا۔"

"شیش ناگ کے مندر کا پروہت!"

"ہاں۔" میں نے کہا اور شاید یہ وہی شخص تھا جس نے تمہیں پیدا ہوتے ہی دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔"

”وہ۔۔ وہ میرا باپ تھا۔۔۔۔! وہ میرا باپ تھا!“ اُوشا ایک دم چیخ اُٹھی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھُپا کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

”تم نے مُجھے اُس وقت کیوں نہیں بتایا کہ وہ میرا باپ تھا؟ میں اُسی کی ایک جھلک دیکھنے پشکلاوتی گئی تھی۔ میں اُس کے پاؤں چھُونا چاہتی تھی۔ تُم نے مُجھے اُس وقت کیوں نہیں بتایا، انوشا؟“

”بتا بھی دیتا تو کیا ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے تو صرف اپنا چہرہ دِکھایا تھا، صرف یہ بتانے کے لیے کہ تُم نے شیش ناگ کا قرض ادا کر دیا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی تُم نے اُسے دیکھ بھی لیا۔ ایک جھلک ہی سی۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ اِس دُنیا سے چلے جانے والوں کی ایک جھلک بھی کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔“

اُوشا نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے آنسو بہاتی رہی۔ عجیب بات تھی! شیش ناگ کا قرض ادا ہو جانے پر اُوشا کو خوشی ہونی چاہیے تھی، مگر اُس کے باپ کی ایک جھلک نے خوشی کے بجائے غم اُس کے

دامن میں ڈال دیا تھا، اُس کے ہونٹوں سے مُسکراہٹ چھین کر اُس کی آنکھوں کو آنسو بخش دیے تھے۔ اُس باپ نے جس نے بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اُسے دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا اور جواب اِس دُنیا میں بھی نہیں تھا!

کانگ مار کی ناگن

سارنگ بابا دیوار سے ٹیک لگائے، پاؤں پسارے کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے تھے، وہ ہمارے ساتھ واسُکی راجا کے مندر جانے کے بجائے راج محل کے اُسی مہمان خانے میں ٹھہرے رہے تھے جہاں راجا شبدیال نے ہمارے رہنے کا بندوبست کیا تھا۔ جب میں اور اُوشا مندر کی طرف چلے تھے تب بھی وہ دیوار سے ٹیک لگائے اور پاؤں پسارے کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے نظر آتے تھے، اور جب ہم شام کے بعد واپس آئے، تب بھی وہ اِسی حال میں تھے۔ اُنہوں نے

ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور پھر اپنی سوچوں میں کھو گئے۔

پھر رات گئے کیلاش ہمارے پاس آیا۔ چندرا اُس کے ساتھ تھی، سارنگ بابا اُسی طرح فرش پر پاؤں پسارے دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ میں اپنے سامنے دُودھ کا پیالہ رکھے شانی کو دُودھ پلا رہا تھا، اور اُوشا دوسرے پیالے سے اپنے پالتو سانپ امبر کو دُودھ پلا رہی تھی۔ کیلاش آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سارنگ بابا سے مخاطب ہوا!

"بابا جی، چندرا آ گئی ہے۔ لیکن میں ہی جانتا ہوں کہ میں کیسی کیسی منّتیں کر کے اِسے یہاں تک لایا ہوں۔"

ہم نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ کیلاش کے ساتھ کھڑی ہوئی چندرا سچ مُچ چاند لگتی تھی۔ گوری رنگت، خوب صورت ناک نقشہ اور کنول سی بڑی بڑی آنکھیں۔

"آؤ، کیلاش بیٹے۔" سانگ بابا نے کہا۔ "آگے آ جاؤ۔"

کیلاش اور چندرا دو قدم آگے بڑھ آئے۔ چندرا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سارنگ بابا کو سلام کیا، اور جب اُس کی نظریں مُجھ پر اور اُوشا پر پڑیں تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ پھر وہ اُوشا کی طرف آئی اور اُس کے پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ”اُوشا دیوی، میں نے آپ کو ناچتے دیکھا تھا۔ میں کانگ مار سے آئی تو اِسی لیے تھی کہ ناگ دیوتا کے سامنے اپنے ناچ کا نذرانہ پیش کروں، مگر آپ کے ہیروں جیسے ناچ کے سامنے میرے کانچ کے ٹکڑوں جیسے ناچ کو کون پُوچھتا۔ اِس لیے میں باہر ہی رہی۔“ اُوشا نے چندرا کی اِس تعریف سے ذرا بھی اثر نہیں لیا۔ خالی دُودھ کا پیالہ ایک طرف ہٹا کر اُس نے امبر کو ہاتھ میں تھام لیا اور پھر چندرا سے پوچھا۔

”تم کانگ مار کی سپیرن ہو؟“

”ہاں۔“

اُوشا نے اُسے ذرا غور سے دیکھا اور کہنے لگی۔ ”تُم تو مُجھے کانگ مار کی سپیرن کے بجائے کانگ مار کی ناگن لگتی ہو۔“

چندرا کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ اُوشا پھر بولی۔ ”سچ مُچ تم کانگ مار کی ناگن لگتی ہو!“

پھر وہ سارنگ بابا سے کہنے لگی۔ ”بابا جی! آپ ہی بتائیے۔ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟“

یہ کہہ کر وہ چندرا کا ہاتھ تھام کر سارنگ بابا کے سامنے لے آئی اور بولی۔ ”بتائیے، کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟“

سارنگ بابا نے اُوشا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اُوشا کی بات سے چندرا کا رنگ اُڑا جا رہا ہے۔

”بیٹھ جاؤ!“ سارنگ بابا نے کُچھ دیر بعد کہا۔ ”دونوں بیٹھ جاؤ۔“ کیلاش اور چندرا سارنگ بابا کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ سارنگ بابا کہنے لگے ”اے کانگ مار کی چندرا! ہم جانتے ہیں کہ تُونے کیلاش کی جان بچائی تھی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ

کیلاش نے تُجھے اپنی بیوی بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تُو نے کیلاش سے کہا تھا کہ اگر تُم نے اس وعدے کی لاج نہ رکھی تو یاد رکھو میں تمہیں ناگن بن کر ڈس لوں گی۔ ہم، کیلاش کی بھلائی کی خاطر، تُجھ سے چند باتیں پُوچھنا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ اگر جھوٹ بولا تو یاد رکھ! تیرا جھوٹ چھُپ نہیں سکے گا، تیری آنکھوں کے سامنے ہی ظاہر ہو جائے گا۔"

اتنا کہہ کر سارنگ بابا نے ذرا دیر کے لیے خاموشی اختیار کی۔ پھر بولے۔ "سب سے پہلے یہ بتا کہ تُو شروع سے کانگ مار ہی میں ہے یا کوئی اور جگہیں بھی دیکھی ہیں؟"

"میں کئی اور جگھوں پر بھی رہی ہوں۔" چندرا نے رُک رُک کر جواب دیا۔

"اننت ناگ میں بھی رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"کئی سال پہلے کی۔" "تُجھے اُس وقت کی باتیں یاد تو ہوں گی۔ یہ بتا کہ جب تو اننت ناگ میں تھی تو ایک بار سخت بیمار بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں۔"

"تیری خبر گیری کے لیے تیرا بھائی سیالکوٹ سے تیرے پاس آیا تھا اور بہت دِنوں تک تیرے پاس ٹھہرا رہا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"تیرے بھائی کے پاس وہ طاقت نہیں تھی جو تیرے پاس ہے۔ مگر تُو بھی اُسی راستے پر چل رہی ہے جس پر تیرا بھائی چل رہا تھا۔ وہ راج کُماری چمپا پر اپنا حق جتاتا تھا اور تو کیلاش پر اپنا حق جتا رہی ہے۔ جس طرح وہ اپنی جان سے گیا، اِسی طرح تو اپنی جان سے جائے گی۔"

سارنگ بابا کی یہ باتیں کیلاش کے پلّے بالکل نہیں پڑ رہی تھیں۔ خود میں بھی اُن کی زبان سے راج کُماری چمپا کا ذکر سُن چونک اُٹھا تھا۔ راج کُماری چمپا پر حق تو ہمارے بھگوڑے سانپ نے جتایا تھا۔ تو کیا وہ سانپ اِس چندرا کا بھائی تھا؟ اِس کا مطلب یہ ہے کہ چندرا اصل میں ناگن ہے! تو کیا اُوشا نے اُسے ٹھیک کہا تھا کہ تُم کانگ مار کی سپیرن کے بجائے کانگ مار کی ناگن معلوم ہوتی ہو؟

چندرا کے ہونٹوں کو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ سارنگ بابا نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ہنڈیا نکالی اور بولے۔ ”لے، ہم تُجھے ایک چیز دِکھاتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا نے ہنڈیا کا ڈھکن ہٹا کر اُسے چندرا کے سامنے کر دیا۔ اِس ہنڈیا میں اُسی بھگوڑے سانپ کی راکھ تھی جسے ہم نے سیالکوٹ کے راجا کے محل میں راج کُماری چمپا کے جسم سے الگ کر کے قابو میں کیا تھا۔

چندرا نے ایک نظر اُس راکھ کو دیکھا، سونگھا اور پھر آیک چیخ اُس کے ہونٹوں سے نکلی۔ ”بھیّا!“ اور اِس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

سارنگ بابا نے مجھے اشارہ کیا۔ ”ہاں، انوشا بیٹے! وہی اپنے بھگوڑے سانپ والی دُھن بجاؤ۔“

میں نے شانی کو سارنگ بابا کے حوالے کیا اور پھر بِین پر وہ دُھن بجائی شروع کی۔ کیلاش حیرانی سے یہ سب کُچھ دیکھ رہا تھا۔

جیسے جیسے میری بِین کی لَے تیز ہوتی گئی، بے ہوش چندرا کا بدن بل کھانے لگا۔ پھر کُچھ دیر بعد ہی گوری رنگت، خوب صورت ناک نقشے اور کنول جیسی بڑی بڑی آنکھوں والی چندرا ایک کالی سیاہ ناگن میں تبدیل ہو گئی۔

”مہاراج۔“ کیلاش حیرانی سے چیخ اُٹھا۔ ”یہ کیا ہے مہاراج؟“

سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ ”یہ تمہاری چندرا کا اصل روپ ہے۔“

اُن کے اِشارے پر میں نے بِین اپنے ہونٹوں سے ہٹالی اور اُس ناگن کو ایک پٹاری میں بند کر دیا۔

”یہ سب کیا ہے، بابا جی۔“ کیلاش نے پوچھا۔

”تمہاری چندرا اصل میں ناگن ہے، سارنگ بابا بولے۔

”میں اب کیا کروں، بابا جی۔“ کیلاش نے کہا۔ ”جس چندرا کو میں اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا، وہ ناگن نکلی۔ اب میں کیا کروں؟ کیا کروں، مہاراج؟“

”جاؤ اور جا کر آرام سے سو جاؤ۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”تمہارے کرنے کے لیے اب کُچھ نہیں رہا۔ تمہاری ناگن ہمارے پاس ہے اور ابھی ہمارے پاس ہی رہے گی۔ اب ہم جانیں اور یہ ناگن جانے۔“

راج کُماری چندرا

میں پشکلاوتی میں شِیش ناگ کے مندر میں ناگ دیوتا کی مورتی کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ میرے ایک طرف میری ماں کھڑی تھی اور دوسری طرف میرا ماموں جو شیش ناگ کے مندر کا پروہت تھا۔ دونوں بہن بھائی مُسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتے تھے اور پھر اِشاروں میں کُچھ باتیں کرتے تھے۔ اچانک مندر کے دروازے سے اُوشا اندر داخل ہوئی۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں سفید گلاب کا پھول تھا اور دائیں ہاتھ میں ایک کٹار جِس کی دھار بڑی تیز تھی۔

اُوشا سیدھی میری طرف آئی اور میرے قدموں کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے پہلے میرے ماموں کی طرف دیکھا اور پھر وہ آگے بڑھ کر مُجھ پر جھُکی، اپنے دائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی کٹار سے میرا سینہ چیرا اور سفید گلاب کا پھُول میرے سینے کے اندر رکھ کر سینے کو بند کر دیا۔ ایسا کر کے، اُس نے پہلے میرے ماموں کی طرف دیکھا اور پھر میری ماں کی طرف۔ اُس نے اِشاروں میں اُن سے باتیں کیں، پھر جھُک کر اُنہیں سلام کیا اور واپس چلی گئی۔

میرے سینے سے نہ تو کوئی خُون نکلا اور نہ میں نے کوئی تکلیف محسوس کی۔ مُجھے یہ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میرے سینے کے اندر کوئی چیز رکھی ہوئی ہے۔

اُوشا کے جانے کے بعد ماموں اور ماں مُسکراتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگے۔ اُنہوں نے پھر اِشاروں میں کُچھ باتیں کیں۔ اِس کے بعد ماموں مُجھ پر جھُکے اور میرا ماتھا چوم کر باہر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد کُچھ دیر تک میری ماں مُسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اُس نے

میرے سر پر ہاتھ پھیرا، گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے چُوما اور پھر میرا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے کہہ رہی ہو؟

”اچھّا، انوشا بیٹے! اب میں جاتی ہوں۔“

میری آنکھ کھُل گئی۔۔۔اُوشا میرا شانہ جھنجھوڑ رہی تھی۔

”انوشا! انوشا!“

”یہ کیا ہے؟ میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔“

”وہ چندرا، وہ ناگن، کانگ مار کی ناگن۔۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا اُسے؟“ میں نے کہا۔ ”وہ بھاگ گئی ہے۔“

یہ سُنتے ہی میں ایک دم اُچھل کر بستر سے نکلا اور اُس پٹاری کی طرف بڑھا جس میں، مَیں نے کانگ مار کی ناگن چندرا کو بند کیا تھا۔ ڈھکنا کھُلا ہوا تھا، پٹاری خالی

تھی اور سارنگ بابا اُسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

”یہ کیسے ہو گیا، بابا جی؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”شاید تُم نے پٹاری کا ڈھکنا مضبوطی سے بند نہیں کیا ہو گا۔ یہ تو اپنے بھائی سے بھی زیادہ تیز نکلی۔“

”وہ کہاں گئی ہو گی؟“ میں نے پوچھا۔

”کون جانے!“ سارنگ بابا بولے۔ ”ہو سکتا ہے کانگ مار واپس چلی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے اُس نے کسی اور طرف کا رُخ کیا ہو۔“

سارنگ بابا کے یہ الفاظ سُن کر میں کُچھ دیر تو خالی پٹاری کو دیکھتا رہا اور پھر میرا ذہن رات کے عجیب و غریب خواب کے بارے میں سوچنے لگا۔

یہ کیسا خواب تھا؟ میری ماں اور ماموں کے درمیان اِشاروں اِشاروں میں کیا باتیں ہوتی رہی تھیں؟ اُوشا نے میرا سینہ کیوں چیرا تھا؟ اُس نے میرا سینہ چیر کر

اُس کے اندر سفید گلاب کیوں رکھا تھا؟ اُس سفید گلاب کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

میں نے بہت سر مارا، لیکن سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے سارنگ بابا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی خالی پٹاری کی طرف دیکھ رہے تھے، مگر اب وہ کسی سوچ میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے تھے، پھر میں نے اُوشا کی طرف دیکھا وہ اپنے سانپ امبر سے کھیل رہی تھی، مگر خوشی نہیں، بُجھے بُجھے سے دِل کے ساتھ۔

کوئی تین دِن تک ہماری یہی حالت رہی، جیسے ہم نے چُپ کا برت رکھا ہوا ہو۔ سارنگ بابا خاموش تھے۔ میں خاموش تھا۔ اُوشا خاموش تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اِس خاموشی کے بعد کوئی طوفان کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔

چوتھے دِن یہ طوفان، یہ غیر معمولی واقعہ، ہمارے سامنے آ گیا۔ دھولا گری سے ایک گھُڑ سوار آندھی کی طرح گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا تھا اور خبر لایا تھا کہ رُوپ وتی کی چھوٹی بہن چندرا کو ایک سانپ نے ڈس لیا ہے۔

ہم۔۔۔ سارنگ بابا، میں اور اُوشا۔ تینوں بجلی کی سی تیزی سے دھولاگری پہنچ گئے۔ راجاہرنام غم کی تصویر بناہوا تھا۔ اِس لیے نہیں کہ اُس کی بیٹی کو سانپ نے ڈس لیا تھا، اِس لیے کہ معاملہ بہت اُلجھ گیا تھا۔ سانپ نے چندرا کو ڈسنے کے بعد اُسے چھوڑا نہیں تھا بلکہ اُس کے جسم سے چمٹ کر بیٹھ گیا تھا، اور وہ کسی کو اُس کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔

یہ سُن کر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ سارنگ بابا کے لبوں پر اُبھری اور وہ راجا سرنام کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ”گھبرایئے نہیں، سب کُچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہم محل کے اُس کمرے میں پہنچے جہاں راج کُماری چندرا کی لاش ایک بستر پر پڑی تھی اور بستر کے ایک کونے سے سانپ کا پھن جھانک رہا تھا۔ ہم نے دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ کانگ مار کی ناگن تھی۔ کانگ مار کی چندرا نے دھولاگری کی چندرا کو ڈس لیا تھا۔

اُوشا کے ہونٹوں پر ایک مُسکراہٹ اُبھری جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ ”دیکھا! مُجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ یہاں آئی ہے۔ اُس روز میں یہی کہنا چاہتی تھی۔“

”آیئے، آیئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ آپ یہاں آئیں گے۔“ یہ چندرا ناگن کی آواز تھی۔

”تُم کیا چاہتی ہو؟“ سارنگ بابا نے پوچھا۔

چندرا ناگن نے شُوں شُوں کی آواز میں جواب دیا۔ ”آپ کو اچھّی طرح معلوم ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں کیلاش کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اور اگر میں کیلاش کو نہیں پا سکتی تو راج کُماری بھی اُس کی بیوی نہیں بن سکے گی۔“

سارنگ بابا کہنے لگے۔ ”تُو نے کیلاش کی خاطر راج کماری چندرا کی جان لے لی، مگر یہ تو بتا کیا تُو کیلاش کی خاطر راج کُماری چندرا کو اپنی جان بھی دے سکتی ہے؟“

چندرا ناگن نے شُوں شُوں میں جواب دیا۔ ”میں آپ بات نہیں سمجھی؟“

”بات تو بہت صاف ہے، کانگ مار کی ناگن۔ راجا کماری چندرا مر چکی ہے لیکن چندرا ناگن زندہ ہے۔ تو اگر چاہے تو تیری جان راج کُماری چندرا کے جسم میں جا سکتی ہے۔“

چندرا ناگن نے جھُومتے ہوئے شُوں شُوں کی ”یہ جیسے میرے دِل کی بات ہے۔ جسم کا کیا ہے، ایک نہ سہی دوسرا سہی۔ اِس میں روح تو میری ہو گی۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ سانگ بابا نے کہا۔ ”ابھی اِس کا بندوبست ہوا جاتا ہے لیکن اِس سے پہلے تُجھے راج کُماری چندرا کے جسم میں سے اپنا زہر نکالنا ہو گا۔“

سارنگ بابا کی یہ بات سُن کر کانگ مار کی ناگن نے اپنا مُنہ راج کُماری چندرا کی داہنی پنڈلی پر اُس جگہ لگا دیا جہاں اُس نے راج کُماری کو ڈسا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے بین بجائی شروع کر دی۔ یہ مہا تالی تھی۔

مہا تالی یہ اثر پہلے بھی کئی بار دِکھا چکی تھی۔ اِس کے اثر سے ناگن کا سارا زہر راج

کُماری چندرا کے جسم میں سے کھِنچ کھِنچ کر کانگ مار کی ناگن کے جسم میں واپس پہنچنے لگا۔ راج کُماری کی لاش سے زہر نکلتا گیا، اُس کی نیلاہٹ کم ہوتی گئی اور پھر جیسے بالکل ختم ہو گئی۔

جب کانگ مار کی ناگن راج کُماری چندرا کے جسم سے سارا زہر چُوس چُکی تو وہ راج کُماری کے بستر سے نیچے اُتر آئی اور ہم سے دو قدم کے فاصلے پر کُنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے اپنا پھن اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور شُوں شُوں کی، وہ کہہ رہی تھی۔

"اب کیا حکم ہے، بابا جی؟"

سارنگ بابا نے اپنے تھیلے سے ایک چِکنی سی دوا نکالی اور اُسے اُوشا کو دیتے ہوئے کہا۔ "لو، اُوشا بیٹی۔ اِسے راج کُماری کے سینے اور پیٹ پر مل دو۔"

اُوشا نے آگے بڑھ کر وہ دوا راج کُماری چندرا کے سینے اور پیٹ پر مل دی۔ اِس

کے بعد سارنگ باباکانگ مار کی ناگن سے کہنے لگے!

”لو، آؤ اور راج کُماری کے مُنہ پر مُنہ رکھ کر لیٹ جاؤ۔“ کانگ مار کی ناگن نے سارنگ بابا کے حُکم کی تعمیل کی۔ سارنگ بابا نے شانی کو ایک ہاتھ میں تھام لیا اور مُجھ سے بولے!

”ہاں، انوشا بیٹے۔ اب شانی والی دُھن بجاؤ۔“

میں بِین بجاتا رہا اور شانی سارنگ بابا کے ہاتھ میں بے چینی سے بل کھاتا رہا۔ جیسے جیسے بِین کی لَے تیز ہوتی گئی۔ شانی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ سارنگ بابا نے ایک ہاتھ سے شانی کی گردن پکڑ رکھی تھی اور دوسرا ہاتھ وہ کانگ مار کی اُس ناگن کے جسم پر پھیر رہے تھے جو راج کُماری چندرا کی لاش کے مُنہ پر مُنہ رکھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ ناگن کی دُم سے شروع ہو کر اُس کے مُنہ کی طرف ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ناگن کی جان کو اُس کے جسم سے کھینچ کر اُس کے مُنہ میں جمع کر رہے ہیں، تاکہ اُسے راج کُماری چندرا کے جسم میں مُنتقل کر سکیں۔

اِس کے ساتھ ہی وہ مُنہ ہی مُنہ میں کوئی منتر بھی پڑھ رہے تھے۔

پھر سارنگ بابا نے شانی کا مُنہ ناگن کی دُم کے قریب کر دیا۔ آگ کا ایک شعلہ سا لپکا اور ناگن کی دُم خُشک لکڑی کی طرح جل اُٹھی۔ سارنگ بابا نے شانی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا اور ناگن کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ اُس کا مُنہ راج کُماری چندرا کی لاش کے مُنہ پر مضبوطی سے جما رہے۔ میں بِین بجائے جا رہا تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ کانگ مار کی ناگن کا جلتا ہوا جِسم حرکت نہیں کر رہا تھا اور ناگن کے جِسم کی آگ راج کُماری چندرا کی لاش پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھی۔

پھر جب آگ ناگن کے مُنہ تک پہنچی تو سارنگ بابا نے بِین بند کرنے کا اِشارہ کیا۔ میں نے بِین ہونٹوں سے ہٹائی اور ذرا غور سے راج کُماری چندرا کی طرف دیکھا۔ کانگ مار کی ناگن دُم سے مُنہ تک جل کر راکھ ہو چکی تھی اور جلی ہوئی رسّی کی طرح راج کُماری چندرا کی لاش کے سینے پر پڑی دِکھائی دیتی تھی۔

سارنگ بابا نے ناگن کی راکھ کو بڑی احتیاط کے ساتھ سمیٹ کر ایک پوٹلی میں

باندھ لیا۔ پھر پانی کی ایک بالٹی منگوائی اور اُسے راج کُماری چندرا کی لاش پر انڈیل دیا۔ پانی کا انڈیلنا تھا کہ قُدرت نے وہی رنگ دکھایا جو بانکے مُرلی والے کی صُورت میں دِکھایا تھا۔ جس طرح بانکا مُرلی والا جھر جھری لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اِسی طرح راج کُماری چندرا بھی جھر جھری لے کہ یُوں اُٹھ بیٹھی جیسے گہری بے ہوشی سے ہوش میں آئی ہو یا ایک لمبی نیند کے بعد جاگی ہو۔

راج کُماری چندرا کو یُوں اُٹھتے دیکھ کر ہمارے اِرد گرد کھڑے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، مگر یہ چیخیں خوف کی نہیں حیرانی اور خوشی کی تھیں۔ سارے محل میں شور مچ گیا۔ ڈھولا گری، کے بچّے بچّے تک خبر پہنچ گئی کہ وہ راج کماری چندرا، جسے ایک سانپ نے ڈس لیا تھا، اُسے کئی دِن کے بعد سارنگ بابا نے زندہ کر دیا ہے۔

مگر یہ بات یا تو ہمیں معلوم تھی یا راج کُماری چندرا کو، کہ اب اُس کے جسم میں جو جان ہے، وہ اُس کی اپنی نہیں، کانگ مار کی اُس ناگن کی ہے جو کیلاش سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

اور یُوں وہ مُشکل اپنے آپ حل ہو گئی جسے حل کرنے کی خاطر راجا شبدیال اور کیلاش ہمارے پاس آئے تھے۔ اب کیلاش کو کانگ مار کی ناگن سے کوئی خطرہ نہ تھا، اِس لیے کہ وہ خود اپنا جسم چھوڑ کر راج کُماری چندرا کے جسم میں آ گئی تھی۔ اب اُس کے لیے راج کُماری چندرا کے ساتھ شادی سے اِنکار کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی۔

چند دِن بعد ہی راج کُماری چندرا اور کیلاش کی شادی نہایت دھوم دھام سے ہو گئی۔ ہم شادی تک وہیں ٹھہرے اور اِس کے بعد آگے چل دیے۔ اب ہماری منزل کوہ شوالک میں شیل شر نگن کی وہ پہاڑی تھی، جہاں سارنگ بابا کے گرو ناگیش مہاراج رہتے تھے اور جِن کے قدموں میں سارنگ بابا نے اپنی عُمر کا ایک حصّہ گُزارا تھا اور اُن سے بہت کُچھ سیکھا تھا۔